نواے ادب

(ششماہی)

جلد ۴۶ ، شمارہ ۱ — اپریل ۱۹۹۶ ع

•

•

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲ ، دادا بھائی نوروجی روڈ ، بمبئی ۰۱

انجمن اسلام

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مشاورتی مجلس

(بمبئی یونیورسٹی کے ضابطہ کے مطابق)

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

●

چیئرمن

جناب رضوان حارث

●

سیکریٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

●

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب عبدالستار زری والا
پروفیسر اے اے قاضی	جناب عبدالعلیم کھٹکھٹے
ڈاکٹر ایس اے شیخ	

● ● ● ●

مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

●

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب رضوان حارث	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
معتمد اعزازی		خازن اعزازی
جناب عبدالمجید ای پالکا		جناب یوسف دلال
شریک معتمد		شریک خازن
جناب عبدالستار زری والا		جناب ایس اے قادری

اراکین

جناب سمیع خطیب	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب سعید دادرکر
جناب احمد آر پیر محمد	جناب رضوان فاروقی	جناب غازی شیخ
جناب خلیفہ ضیاء الدین	پروفیسر عبدالقادر قاضی	جناب عبدالعلیم کھٹکھٹے
ڈاکٹر ظفر خان	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر	ڈاکٹر ایف ٹی پنجاریا

● ● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے جاری)

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

•

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۴٦ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹٦ ع

•

منــــدرجات

احوالِ واقعی

جسٹس طیب جی اور سوا سو سالہ انجمن اسلام۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ عموماً ہمہ کمالات شخصیتوں نے جہاں اپنے فکر و نظر اور علم و عمل سے عصری ضرورتوں اور ہنگامی تقاضوں کے پیش نظر قوم و ملک کو شاہراہ ترقی پر گامزن کرنے کی سعی کی وہاں انہوں نے قدیم روایتوں اور جدید تقاضوں کا نہ صرف امتزاج پیدا کیا بلکہ ایک زبردست انقلاب برپا کردیا اور بقول کسی ع

گر زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اور اہالیانِ قوم کو بالخصوص انہوں نے پرانی روایات کے ساتھ جدید ضروریات کی طرف مائل کردیا اور عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جسٹس بدرالدین طیب جی ان ہی چند برگزیدہ ہستیوں میں ایک تھے جنہوں نے نظامِ تعلیم کی طرف توجہ کی اور انہماک کے ساتھ عروس البلاد بمبئی میں اپنے رفقائے کار کے ساتھ ملکر ۱۸۷۶ء میں انجمن اسلام کی نیو ڈالی اور اس تعلیمی ادارے میں پہلی مرتبہ اردو فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی اور مغربی علـــوم کی تعلیم کا اہتمام کیا اور درحقیقت یہ علمی و ثقافتی ادارہ آج ایک جامعہ کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ مرحوم جسٹس طیب جی کے بعد فعّال صدور میں سیف طیب جی صاحب، بیرسٹر پیر بھائی صاحب، بیرسٹر اتوالیے صاحب اور معین الدین حارث صاحب کے بعد کوئی ایک دہے سے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب صدر نشین ہیں جنہوں نے انجمن کی کارگذاریوں کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور انکے ذوق و شوق اور توجہ، انہماک کے پیش نظر اراکین انجمن نے ماہِ گذشتہ کے وسط میں ایک مرتبہ اور ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کو بالاتفاق رائے صدر کے عہدہ پر منتخب کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب انجمن کے کاموں میں باقاعدہ دلچسپی ہی لیتے نہیں رہینگے بلکہ اس کے بڑھاوے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہینگے اور جسٹس بدرالدین طیب جی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرکے رہینگے۔ ہم انکی خدمت

میں ہدیۂ مبارکباد اس دعا کے ساتھ پیش کرتے ہیں ع

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کل ہند فارسی اور عربی اساتذہ کے اجتماعات :

دسمبر ۱۹۹۵ ع کے اواخر اور جنوری ۱۹۹۶ ع کے وسط میں کل ہند فارسی اساتذہ اور عربی اساتذہ کی کانفرنسیں بمبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوئیں اور اس موقع پر انجمن اسلام (بمبئی) نے مندوبین کو ظہرانہ اور عشائیہ پر مدعو کیا۔ صدر انجمن ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں انجمن کی کارگذاریوں سے متعلق مدعوئین کو جانکاری دی، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ناظم ڈاکٹر این ایس گوریکر نے خیرمقدمی تقریر کی اور جنرل سیکریٹری عبدالمجید پالکا صاحب نے ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے کہا ع

شکریہ لازم ہے ہم پر آپ کا

این سی ای آر ٹی ورکشاپ :

دہلی کے این سی ای آر ٹی کی سرپرستی میں (تاریخ ادب اردو) کے سلسلے میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے زیر اہتمام ایک کارگاہ منعقد ہوئی جس میں نیشنل کونسل ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ ٹریننگ (دہلی) کے سربراہ ڈاکٹر محمد صابرین اور ناظم اعلیٰ ڈاکٹر این ایس گوریکر کے علاوہ دہلی سے آئے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر خالد محمود کے ساتھ بمبئی کے حامداللہ ندوی صاحب، یونس اگاسکر صاحب، رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ زہرہ موڈک صاحبہ اور مشتاق مومن صاحب نے شرکت فرمائی۔ اختتامیہ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب نے فرمائی۔ مندوبین حضرات اور خواتین نے اپنے تجربات کا ذکر کیا اور ڈاکٹر صابرین صاحب نے این سی ای آر ٹی کی جانب سے شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر گوریکر صاحب نے انجمن کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش کیا ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اردو عالمی ایوارڈ :

مقام مسرت ہے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے نامور صدر

ہماری زبان کے ممتاز مدیر، اردو زبان و ادب کے مستند استاد، اردو اور انگریزی کے مقبول قلمکار، پروفیسر آل احمد سرور صاحب کو حال میں اردو عالمی ایوارڈ سے نوازا ہے جن کے زیر عاطفت سینکڑوں تشنگانِ علم نے استفادہ کیا اور جنھوں نے اپنے رشحاتِ قلم سے تالیفات کی صورت میں اردو ادب کے ذخیرہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ سرور صاحب اس اعزاز کے ہر اعتبار سے مستحق تھے۔ ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اعزازات سے نوازے ع

اللہ کرے آپ کے اعزاز میں ہو اور اضافہ

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر

ہمدرد یونیورسٹی (دہلی) کے سربراہ حکیم عبدالحمید صاحب کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ نے انہیں متفقہ طور پر یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا ہے۔ دراصل حکیم صاحب کی چانسلر شپ نے یونیورسٹی کے مرتبہ کو اور بلند کیا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں تحفۂ تہنیت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو برقرار رکھنے میں ہر ممکن کوشش کرتے رہیں گے اور دعا ہے کہ ع

تم سلامت رہو ہزار برس

انتقال پرملال

ہمیں یہ لکھتے ہوئے ملال ہو رہا ہے کہ گذشتہ چھ مہینوں میں دنیائے ادب کی شہرۂ آفاق شخصیتیں اس دار فنا سے دار بقا کو سدھاریں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر، اردو کے مقبول استاد اور نامور ادیب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، شہر بمبئی کے مشہور و معروف نظم گو شاعر اختر الایمان صاحب اور مہاراشٹرہ کی علمی شخصیت مولانا عبدالصمد ندوی صاحب جنہوں اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے، انتقال فرمایا ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والوں میں

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

«آزادیات» کا مطالعہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

از

ڈاکٹر گیان چند جین، اندرا نگر، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶

(۱)

پروفیسر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں جتنی سوانحی کتابیں یا رسالوں کے خصوصی نمبر سامنے آئے ہیں، اتنے کسی دوسرے معاصر اردو ادیب سے متعلق نہیں۔ مجھ پر ان کا یہ غیر معمولی لطف رہا ہے کہ اپنی تقریباً ہر کتاب مجھے بھیجتے ہیں اور راہِ کرم یہ پیشکش کرتے رہتے ہیں کہ آپ کو میری جو کتاب درکار ہو بے تکلف لکھیے، لیکن اس کے باوجود کسی صلے کا تقاضا نہیں کرتے۔ انھوں نے مجھے کبھی نہیں لکھا کہ میں ان کی کسی کتاب پر اپنی رائے دوں، تبصرہ لکھوں، حالانکہ بڑے بڑے عمائد رائے یا تاثر کی فرمائش کرتے ہیں جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ غیر مشروط تحسین رقم کردی جائے

میں ایسا احسان فراموش کہ میں نے کبھی ان کی کسی کتاب پر کوئی مضمون نہیں لکھا پھر غیر مطبوعہ نامکمل شعری جمہور نامہ کے میں نے انھیں پچھلے سال لکھا کہ اپنے تصنیفی کاموں سے فرصت ملنے پر آپ کے کسی پہلو پر لکھوں گا۔ میری اس بات کا انھوں نے اپنے کسی خط میں کوئی ذکر نہیں کیا کیا سمائی ہے! میں اپنے تجربے کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسا (نیکی کر اور دریا میں ڈال) قسم کا آدمی نہیں دیکھا جو اس وضع داری سے اپنی کتابیں رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجتا رہے لیکن کبھی اشارۃً بھی نہ چاہے کہ ان کے بارے میں ایک جملہ لکھ دیا جائے۔ میں نے از خود طے کیا کہ ان پر کچھ نہ کچھ لکھوں گا، محض تحسین تک محدود نہیں رہوں گا بلکہ دوسروں کے نشان دادہ ان معاہدوں کو بھی نمایاں کروں گا جن میں آزاد صاحب پر چٹکی لی گئی ہے۔

میں نے موضوع کی تلاش کی تو مجھے سوجھا کہ ان کے بارے میں جو کتابیں اور رسالوں کے خصوصی نمبر آچکے ہیں ان کا کچھ تنقیدی، کچھ تاثراتی جائزہ

اوں. میرے پاس اس نوع کے یہ مجموعے ہیں :

۱ حمیدہ سلطان احمد (مرتب)۔ جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری۔ طبع چہارم ۱۹۹۱ ع۔ اس کی طبع اول ۱۹۶۴ ع میں منظر عام پر آئی تھی۔

۲ محمد ایوب واقف (مرتب) جگن ناتھ آزاد، ایک مطالعہ۔ طبع اول ۱۹۸۰ ع۔ (مقدمہ ۹ جنوری ۱۹۶۸ ع)

۳ رسالہ العطش، جموں۔ جگن ناتھ آزاد نمبر جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ ع۔

۴ رسالہ لمحے لمحے، بدایوں۔ جگن ناتھ آزاد نمبر جولائی ۸۶ ع تا فروری ۸۸ ع۔

۵ ڈاکٹر ظہور الدین (مرتب)۔ ارمغان آزاد۔ ۱۹۹۳ ع۔ (مقدمہ ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ ع)

۶ ڈاکٹر خلیق انجم (مرتب)۔ جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات) جلد اول ۹۳ ع۔

۷ رسالہ کتاب نما، خصوصی شمارہ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد (شخصیت اور ادبی خدمات) مرتب انجم حبیب خان، اپریل ۱۹۹۴ ع۔

واضح ہو کہ یہ سب کے سب متفرق مضمون نگاروں کی تحریروں کے مجموعے ہیں۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ آج کل جب ہر کہہ و مہ پر کوئی مستقل کتاب یا کتابچہ زیور طبع سے آراستہ ہو جاتا ہے، آزاد جیسے بارسوخ شخص پر کوئی کتاب کیوں نہیں آئی۔ ارمغان آزاد سے معلوم ہوا کہ آزاد پر ذیل کے تحقیقی کام ہو چکے ہیں جن میں سے ۱۹۹۳ ع تک کوئی بھی شائع نہیں ہوا تھا۔

۱ ڈاکٹر رضوان اللہ، ڈی این کالج دربھنگہ۔ جگن ناتھ آزاد، فن اور شخصیت

۲ ڈاکٹر نجم الہدی شیخ جگن ناتھ آزاد، عہد اور فن۔ بمبئی یونیورسٹی

۳ یاسمین کوثر جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور

۴ عاصمہ عزیز جگن ناتھ آزاد بحیثیت نثر نگار، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۵ جمشید رضوانی جگن ناتھ آزاد بحیثیت شاعر۔ خواجہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سہ ماہی پرواز ادب پٹیالہ کا گوشۂ آزاد ۱۹۸۱ ع میں اور سہ ماہی توازن

مالیگاؤں کا گوشۂ آزاد ۱۹۸۴ع میں شائع ہوا۔ دوبئی سے یو،ی کیمٹر نیر انٹرنیشنل کا سووینیر موسومہ بہ جشنِ آزاد ۱۹۹۳ع میں شائع ہوا۔ رسالہ سہیل گیا کا جگن ناتھ نمبر ۱۹۹۳ع میں زیر طبع تھا۔ ہندی میں پرکاش پنڈت کی کتاب جگن ناتھ آزاد کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں جن میں سب سے پہلا ۱۹٦۱ع کا ہے۔

میں صرف ان سات مجموعوں کا جائزہ لوں گا جو میرے سامنے ہیں۔ میں نے ان کے کل مضامین کا اندازہ کرنا چاہا۔ بعد کے مجموعوں میں بہت سے مضامین پیشتر کے مجموعوں سے ماخوذ ہیں۔ میں نے مکررات کو خارج کیا، جگن ناتھ آزاد صاحب کی تحریروں اور دوسروں کے منظوم خراج عقیدت کو بھی شمار میں نہیں لیا تو ساتوں مجموعوں میں دوسرے مصنفین کے کل ۱٦۳ مضامین نظر آئے۔ اقبال نمائش کے سلسلے میں بھی کئی اور لوگوں کی تحریریں ہیں۔ کتاب نما کے آخری مضمون ‹ پروفیسر جگن ناتھ آزاد مشاہیر کی نظر میں › بہت سی مختصر تحریروں کا گلدستہ ہے جن میں کم از کم دو مشاہیر ایسے ہیں جن کی کوئی اور تحریر کسی دوسرے مجموعے میں نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد صاحب کو کم از کم پونے دو سو علما نے خراج تحسین پیش کیا ہے، ان کے مداحوں اور ارادت مندوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ سب الگ الگ دیار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں اتنے زیادہ مضامین کا جائزہ یا تعارف پیش نہیں کرسکتا۔ ہر مجموعے میں چند منتخب مضامین کے بعض اجزا پر توجہ مبذول کروں گا

۱ سب سے پرانا مجموعہ حمیدہ سلطان احمد کا ‹ جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری › ہے۔ اس کے پیش نامے پر مولفہ نے ۲۵ مارچ ۱۹۵۷ع کی تاریخ ڈالی ہے لیکن معلوم نہیں کیوں، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹٦۴ع میں جاکر شائع ہوا۔ مزید تین ایڈیشن ۱۹۷۰ع، ۱۹۸۱ع اور ۱۹۹۱ع میں آئے۔ میرے سامنے ۱۹۹۱ع کا ایڈیشن ہے۔ اس کا پیش نامہ کیا ہے ۲۰ صفحوں کا مضمون ہے۔ اس میں مولفہ حمیدہ سلطان احمد نے فراخ دلی سے مختلف اخباروں اور رسالوں کے اقتباسات دیے ہیں۔ اس کے آگے ۲۲ مضامین پر مشتمل متنِ کتاب ہے جس کے دو بڑے جزو ہیں: ۱ شخصیت اور شاعری، ۲ تصانیف۔ دونوں میں زیادہ فرق نہیں۔ پہلے جزو

میں شخصیت پر بہت کم اور شاعری پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ دوسرے حصّہ میں آزاد کی جن تصانیف پر لکھا گیا ہے وہ سب شعری مجموعے ہی ہیں۔ حمیدہ سلطان نے کتاب کا نام بھی ”جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری“ رکھا ہے اس لیے اس میں آزاد کی نثر کے بارے میں تو لکھا نہیں جاسکتا تھا۔

حریفانہ چشمک کے زیر اثر ایک شاعر دوسرے شاعر کو داد دینے میں عموماً بخل سے کام لیتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ آزاد کو تحفۂ تحسین پیش کرنے والوں میں کتنے ہی مشہور شاعر ہیں مثلاً فراق، نارش پرتاپگڈھی (کذا۔ صحیح پرتاپ گڑھی)، نریش کمار شاد، مخمور جالندھری، کرشن موہن، عبدالحمید عدم، مانی جائسی، مصطفےٰ زیدی، تیغ الہ آبادی۔ ساتھ ہی ایسے عمائد کی کمی بھی نہیں جو نثر کے کسی نہ کسی شعبے میں امتیاز رکھتے ہیں مثلاً کلام حیدری، خواجہ احمد عباس، حامد علی خاں، سر شیخ عبدالقادر، وقار عظیم، آل احمد سرور اور عبدالمجید سالک۔ مجموعہ ۱۹۵۷ء میں مرتب ہوچکا تھا اس وقت جگن ناتھ آزاد اتنے بڑے ادیب نہیں ہوئے جتنے اب ہیں اس زمانے میں اتنے مشاہیر کی توجہ حاصل کرنا بڑے فخر کی بات ہے

اپنے مضمون میں فراق کہتے ہیں کہ فرانس کے سب سے بڑے نقاد سینٹ بیو نے کہا ہے کہ وہ جب کوئی کتاب پڑھتا تھا تو اس کے ادبی و فکری محاسن سے پہلے یہ دیکھتا تھا کہ اس کتاب کا مصنف کتنا اچھا آدمی ہے فراق کے مطابق آزاد کی شاعری کی سب سے زیادہ دلکش صفت آزاد کی نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنع کا نام نہیں اشرف قادری اپنے مضمون میں آزاد کی دو مشہور نظموں ”وطن میں اجنبی“ اور ”بھارت کے مسلماں“ کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ نارش پرتاپ گڑھی فراق کا مضمون پڑھ چکے ہیں اس لیے وہ بھی آزاد کی نیکی اور شرافت کے مدح خواں ہیں۔ وہ آزاد کی شاعری پر کلاسیکی ادب کے اثرات دکھاتے ہیں۔ نریش کمار شاد نے متضاد بات لکھی ہے کہ اقبال کے اثرات کی جڑیں آزاد کے فکر و نظر کے پاتال تک پہنچ گئی ہیں لیکن اب اقبال کے اثرات والے اشعار کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ شاد آزاد کے سیاسی شعور کے ابہام پر

توجہ دلاتے ہیں کہ ایک طرف وہ ترقی پسندوں کی طرح زمانۂ جنگ میں سامراج کے زر خرید سپاہیوں کی مدح کرتے ہیں ـــــ

ہند کی فوج ظفر موج جہاں جائے گی   گاڑ دے گی وہیں انگریز کی نصرت کا علم

(نظم انڈیا گیٹ)

دوسری طرف سبھاش چندر بوس کی انقلابی فسطائیت کا عاطفاتی اور رحمتی زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کرتے ہوئے اخباری انداز میں سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں (ص ۹۹) نیتا جی کو فسطائی کہا اور ان کی توصیف کو رحمتی قرار دینا نریش کمار شاد ہی سے ممکن ہے۔ آزاد کی رفیقۂ حیات شکنتلا ۱۹۴۶ ع میں انتقال کر گئیں اس المیے پر آزاد نے دو بڑے شاہکار مرثیے لکھے سعید سہروردی اپنے مضمون میں ان کی داد دیتے ہیں (ص ۲۵ ـ ۱۲۲)

دوسرے جزو تصانیف کی ابتدا میں ص ۱۶۶ پر ایک گروپ فوٹو ہے جس میں کئی علماء کی جوانی کی جو شبیہ ہے میں اسے ان کے موجـــودہ بشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرہی نہیں سکتا مثلاً سردار جعفری، پروفیسر سرور اور احتشام حسین کا جو فوٹو ہے، ان کے نام نہ دیے ہوتے تو میں ہرگز نہیں پہچان سکتا تھا۔ باب تصانیف میں سر شیخ عبدالقادر کا مختصر مضمون (نذرِ اقبال) ہے۔ یہ آزاد کا ایک مجموعہ تھا جس کا موضوع اقبال اور کلام اقبال رہا ہوگا۔ اس پر شیخ صاحب نے تعارف لکھا لیکن ۱۹۴۷ ع کے ہنگاموں کی وجہ سے یہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا اس کی بعض نظمیں (بیکراں) میں شامل کر لی گئیں دوسرے مضامین (بیکراں) اور (ستاروں سے ذروں تک) کے بارے میں ہیں، صرف عبدالمجیـــد سالک کا مضمون (وطن میں اجنبی) پر ہے ان کی دو مشہور ترین غزلوں کا تذکرہ بہتوں نے کیا ہے آزاد کی شاعری پر ہجرتِ وطن اور فسادات تقسیم کا شدید جـــذباتی اثر پڑا ہے اور ان غزلوں کا یہی موضوع ہے پہلی غـــزل ۱۵ اگست ۱۹۴۷ ع کی یاد میں کہی تھی ـــــ

نہ پوچھ جب آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ   ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو، یہ بیگانوں پہ کیا گزری

دوسری نظم تقسیم کے بعد پہلی بار لاہور پہنچنے پر کہی ہے

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

یہ کتاب اپنے مضمون نگاروں کے قد اور مضامین کے تحسینی لہجے کے سبب کسی بھی قلم کار کے لیے مایۂ افتخار ہوسکتی ہے۔ اس کے چار ایڈیشن نکلنا فن کار کے لیے اور بھی باعث طمانیت ہونا چاہیے

٢ زمانی ترتیب کے اعتبار سے دوسری کتاب محمد ایوب واقف کی (جگن ناتھ آزاد، ایک مطالعہ) ہے اس کے دو ایڈیشن ١٩٨٠ ع اور ١٩٨٨ ع میں علمی مجلس دہلی سے شائع ہوئے لیکن واقف کے دیباچے پر بمبئی، ٩ جنوری ١٩٦٨ ع کی تاریخ ہے حیرت ہے کہ اس کی پہلی چھاپ ترتیب کے ١٢ سال بعد ١٩٨٠ ع میں ہوئی۔ اپنے دیباچے میں واقف لکھتے ہیں

(میں اکثر یہ سوچنے لگتا کہ آخر اتنا بڑا شاعر ہونے کے باوجود آزاد کے ساتھ اردو کے ادیبوں اور نقادوں نے کیوں بے التفاتی برتی اور کون سے وہ اسباب تھے جنھوں نے اس بے التفاتی کو جنم دیا) (ص ٦)

لیکن نقادوں نے ان کے ساتھ بے التفاتی کہاں برتی ہے؟ ١٩٦٨ ع سے پہلے حمیدہ سلطان احمد کی کتاب شائع ہوچکی تھی جو غلغلۂ تحسین بلند کرنے والے معاند کا نگار خانہ ہے واقف اس کی طرف سے چشم پوشی کرنا چاہیں تو اس کا کیا علاج انھوں نے اپنے دیباچے میں کہیں اس کتاب کا نام تک نہیں لیا۔ خود واقف کے مجموعے میں بھی ظ انصاری، ملک زادہ منظور احمد عبدالستار دلوی، احتشام حسین، رام لعل، شاذ تمکنت، اعجاز حسین، صباح الدین عبدالرحمٰن، راجندر ناتھ شیدا، علام السیدین، آدم شیخ، محبت اشرف ندوی، قمر رئیس، امیر چند بہار، شہاب مالیر کوٹلوی اور حامد اللہ ندوی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ ١٩٦٨ ع تک پرکاش پنڈت کی ہندی کتاب (جگن ناتھ آزاد) کے دو ایڈیشن نکل چکے تھے۔ معاصرین میں جوش، فراق اور فیض کو چھوڑ کر اور کس شاعر کو اس مرتبے کے

اور اتنے جوق در جوق مداح ملے ہیں۔ واقف اور کیا چاہتے ہیں؟

مجموعے میں ۲۷ مضامین ہیں جنھیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا کوئی عنوان نہیں۔ اس میں ۲۴ مضامین ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان نثر نگاری ہے اور اس میں محض تین مضامین ہیں۔ اس عنوان سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ پہلا حصہ شاعری کے بارے میں ہے۔ لیکن فہرستِ مضامین میں سہوِ کاتب سے ۵ نمبر پر عبدالمحی رضا کے مضمون کا عنوان «آزاد کی نثری تخلیقات۔ ایک جائزہ» چھپ گیا ہے متنِ کتاب میں اس کے عنوان میں «نثری» کے بجائے «شعری» ہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے پروفیسر ارشد کاکوی کا مضمون حمیدہ سلطان کے مجموعے میں بھی پایا جاتا ہے گویا واقف کے مجموعے میں دیباچے کے بعد ۲۶ نئے مضامین ہیں واقف کا دیباچہ اس طرح مضمون کی شان نہیں رکھتا جو حمیدہ سلطان کے دیباچے میں تھی، میرا ایک اور مشاہدہ۔ واقف نے اپنے دیباچے میں ص ۱۰ اور ص ۱۲ پر «میری فرمائش» کی ترکیب استعمال کی ہے جس طرح اپنے لیے «فرمایا» کا استعمال واجب نہیں، اسی طرح «میری فرمائش» کہنا بھی ناسزا ہے۔ میری درخواست یا التماس کہنا چاہیے۔

مجموعے کا پہلا انشائیانہ مضمون ظ انصاری کا ہے «جگن ناتھ آزاد، میرا یار» عنوان سے اپندر ناتھ اشک کے مضمون «منٹو، میرا دشمن» کی یاد آتی ہے مضمون بڑا دلچسپ ہے اور دل سوزی سے لکھا گیا ہے، گو لنگوٹیا یار کی کہیں کہیں چٹکیاں بھی لی ہیں مثلاً

«وہ نتھنوں اور حلق سے ایک ساتھ برآمد ہونے والا ترنم، وہ فارسی کے گاڑھے رس میں ڈوبی ہوئی ان کی شاعری» (ص ۲۷)

نتھنوں سے نکلنے والے ترنم کی بات پر مجھے ہنسی آئی کہ آزاد کی حد تک یہ کسی قدر سچ معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری میں فارسیت کے رچاؤ کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں یہ خیال اس لیے ہوا ہو کہ آزاد فارسی کے ایم اے ہیں" اقبال کے پرستار ہیں ظ۔ نے آزاد کی اہلیہ کے مرثیے شکنتلا کے جو

اشعار نقل کیے ہیں، ان میں دو یہ ہیں ؎

اے درختو میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب
ایک مرجھائی ہوئی پتی کا منہ چومو گے جب

اے کہ گھبرائی ہوئی تو کڑوی دوا کے نام سے
آگ کے شعلوں میں جا سوتی ہے کس آرام سے

پہلے شعر کی شعریت اور دوسرے شعر کی رقت دیکھ کر کون یہ ماننے سے سے انکار کرسکتا ہے کہ آزاد ایک اچھے شاعر ہیں، لیکن آگے جاکر ط. پھر منفی نشتر چبھوتے ہیں

"میں نے اس رور صرف اتنا جانا کہ ان کی شہرت اور مقبولیت محروم جیسے مشہور اور مقبول شاعر کے شانوں پر سوار ہوکر پورے پنجاب میں گھوم رہی ہے" (ص ۲۰)

"دیکھتے دیکھتے اتنے مشہور ہوگئے کہ ان میں جو ذاتی ہنر کی شوخ کرن تھی وہ ترنم (مشاعرانہ) شاعری کے دھندلکے میں چھپ گئی خود جگن ناتھ آزاد بھی اپنی بیار مندی سے آزاد ہوگئے۔ اپنی ہنرمندی کی درگاہ میں سر بہ سجود ہونا اور اس کے حضور آنکھوں میں رات کاٹنا بہت کٹھن کام ہے" (ص ۲۰)

ط. انصاری لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ع سے ۱۹۶۵ع تک آزاد کی غزل ہو کہ نظم سب میں ترکِ وطن کا درد ابھرا ہوا ہے اور اس قسم کی شاعری ان کی پیشہ ورانہ ترقی میں کئی بار حائل ہوتی ہے جس کی وجہ سے ۱۹۶۵ع کے بعد آزاد ایسے جذبات کے اظہار میں محتاط ہوگئے ہیں لیکن ضبط اور احتیاط کا یہ عمل، شاعر کے جوہر پر زنگ چڑھا دیتا ہے" (ص ۲۴)

ط انصاری کے اس کھنک دار مضمون کے بعد مجھے بے تعلق و بے زبان کا مضمون (جگن ناتھ آزاد کی غیر مطبوعہ مثنوی جمہور نامہ) ہے۔ یہ اس سے پہلے

رسالہ مراج بھوپال بابت جون ۱۹٦۷ء میں شائع ہوا تھا۔ چوتھے نمبر پر سید عبدالمغنی رضا کا مضمون (آزاد کی شعری تخلیقات۔ ایک جائزہ) بہت مفصل، مکمل اور سیر حاصل ہے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کا مضمون ہے تو توصیفی لیکن وہ آزاد سے ایک ملاقات کے سلسلے میں کہتے ہیں

(شعر و شاعری موضوع گفتگو تھی، میں نے کہا سب کچھ درست مگر آزاد صاحب آپ کے کلام میں کہیں کہیں پر زبان اور فن کی خامیاں بہت زیادہ نمایاں ہیں، وہ بولے، مثلاً میں نے کہا میرے حافظے میں فی الحال دو شعر ہیں، سن لیجیے)

مجھ کو نہ سمجھ آئے گی اب میری کہانی ہر لفظ نے تبدیل کیے ایسے معانی

سنبھال کر ہم نے پھر بھی رکھا ہوا ہے آزاد غم کسی کا
اگرچہ زور جنوں کے ہاتھوں ہے دامنِ دل ہزار پارہ

انھوں نے کہا، شاید آپ نے بیکراں کا پہلا ایڈیشن پڑھا ہے، دوسرے ایڈیشن میں میں نے تصحیح کردی ہے) (ص ۷۴-۷۳)

پہلے شعر میں (سمجھ آئے گی) پر اعتراض رہا ہوگا (تیری سمجھ میں نہ آئے گی) ہونا چاہیے۔ دوسرے شعر میں (رکھا) کے بعد (ہوا) کو زائد کہہ سکتے ہیں۔ میں نے ملک زادہ صاحب سے پوچھا تو انھوں نے میرے قیاس کی تصدیق کردی۔ کس کی زبان و بیان مکمل ہوتی ہے۔ سچ ہے تو بعض جگہ میر و غالب کے اظہارات سے بھی آسودگی نہیں ہوتی۔ آزاد کے کلام میں فن و زبان کی خامیوں کا کوئی نمایاں احساس نہیں ہوتا۔

ملک زادہ کے بعد ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا مضمون ہے (اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد)۔ انھوں نے آزاد کے ان دو مرثیوں کی بطورِ خاص داد دی ہے جو انھوں اپنی پہلی بیوی شکنتلا کے انتقال پر لکھے۔ احتشام حسین نے آزاد کے مجموعے (نوائے پریشاں) پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے۔ اس میں بڑی پتے کی بات کہتے ہیں کہ ایک صاحبِ نظر کے مطابق ہر شخص

عملاً دو زندگیاں گزارتا ہے ایک عام سطحی یعنی نظر آنے والی زندگی، دوسری اس کے جذبات اور خیالوں کی دنیا۔ ملک کا بٹوارہ اور آبادی کا منتقل مکانی آزاد کی جذباتی زندگی کا وہ انقلاب تھا جو ان کی شاعری میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے

رام لعل کا مضمون ، جگن ناتھ آزاد۔ ایک اجنبی ، ایک بے تکلف دوست ، ایک عارف آزاد کے مشاہدات کا مجموعہ ہے وہ کہتے ہیں آزاد کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیونکہ معلوم نہیں وہ کس بات پر کس طرح ری ایکٹ کر بیٹھیں قہقہوں کے بیچ سنجیدہ ہوجائے (ص ۱۰۱) میرا مشاہدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے آزاد خود جس ہیں وہ باتوں کے بیچ سنجیدہ ہی نہیں رنجیدہ بھی ہوجاتے ہیں رام لعل نے توجہ دلائی کہ آزاد کس طرح پنجاب کی تقسیم کے المیے سے متاثر ہوئے۔ چونکہ رام لعل خود بھی پنجابی ہیں اس لیے وہ بھی پنجاب کی کسک خوب محسوس کرسکتے ہیں سید مغیث الحسن نے اپنے مضمون ، جگن ناتھ آزاد ، میں حرف گیری کی کہ اردو شعرا کی روایت کے مطابق ایک جگہ آزاد نے تعلّی کے اشعار لکھے جو مناسب نہیں ان میں کا پہلا شعر ہے ؎

تجھے خبر بھی ہے اے سالکان سست نہاد ادب میں کس قدر اونچا ہے رتبۂ آزاد

(ص ۱۱۳)

جمع کے صیغے سالکاں کے پیش نظر پہلا لفظ تجھے کے بجائے تمہیں رہا ہوگا قارئین کو سست نہاد کہنے کی تحریک جوش کے اس مصرع سے ہوئی ہوگی ع

اے پسند کے دلیل غلامانِ روسیاہ

استادی ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے مضمون میں آزاد کے ظاہر کی بڑی شگفتگی سے کہانی کہی ہے لکھتے ہیں۔

، جگن ناتھ آزاد کو پنجابی تصور کرنے میں مجھے بڑا تکلف تھا اور سچ پوچھیے تو اب بھی ہے۔ نہ ان کا رنگ صاف ہے نہ جثہ و جسم میں ضخامت ہے اور نہ لہجہ میں اکھڑپن ، پھر کون سی خصوصیت ہے کہ میں ان کو دیکھ کر خطۂ پنجاب سے منسوب کرسکوں۔ بس ایک ذرا سا آواز کا بھاری پن اور کبھی کبھی

غیظ سے مغلوب ہوجانا اور ریل کے ڈبوں میں مسافروں سے لڑنے پر تیار ہوجانا کچھ ایسی باتیں ہیں . . . کہ ان کو کسی نہ کسی طرح پنجابی سمجھ لیا جائے . . .

کان اتنے بڑے ہیں گویا قدرت نے ان کو جان بیمہ کا پروانہ عطا کردیا ہے کہ سو سال سے پہلے وہ اس دنیا سے کوچ نہ کریں لیکن برخلاف کان اور قد کے آنکھیں چھوٹی ہیں . چہرے پر وہ لطافت یا کیفیت نہیں جو یہ پتہ دے کہ آزاد کو کبھی کسی عورت سے عشق ہوا ہے ، (ص ۳۰ ـ ۱۲۹)

سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا مفصل مضمون ، جگن ناتھ آزاد ، اس مجموعے کا بہترین مقالہ ہے . اس کی ابتدا میں انہوں نے آزاد کی نظم ، بھارت کے مسلمان ، کی بھرپور داد دی ہے . یہ غیر معمولی نظم ہے بھی ہر طرح سے داد کے قابل . پھر وہ آزاد کی مشہور غزل ، سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں ، کی تعریف کرتے ہیں

فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں آزاد کی تحریروں کے کسی گوشے سے صرفِ نظر روا نہیں رکھا حوفِ اطناب سے میں مضمون کا مزید جائزہ نہیں لے سکتا . ڈاکٹر قمر رئیس کے مضمون کا عنوان ، نقشِ ناتمام ، ہے ، فٹ نوٹ میں لکھا ہے ، آزاد کا ایک مجموعۂ کلام جو زیرِ طبع ہے ، (ص ۲۱۰) . مضمون اس مجموعے کا دیباچہ ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس نام سے آزاد کا کوئی مجموعہ شائع ہی نہیں ہوا شاید اشاعت کے وقت نام بدل دیا ہو

شاعری کے جزو کا آخری مضمون ، جگن ناتھ بحیثیت نظم گو شاعر ، مرتبِ مجموعہ محمد ایوب واقف کا ہے جو معیار کے اعتبار سے صباح الدین عبدالرحمٰن کے مضمون کے برابر رکھا جاسکتا ہے نثر نگاری کے جزو میں محض تین مضامین ہیں جن میں سے آخری دو فاضلِ ذکر ہیں نہ مولانا شہاب مالیر کوٹلوی اور حامد اللہ ندوی کے ہیں .

کہا جاسکتا ہے کہ مضامین کے معیار کی رو سے یہ مجموعہ پہلے سے کسی طرح کم نہیں گو اس میں مضمون نگاروں کا پایہ حمیدہ سلطان کے مضمون نگاروں کے برابر نہیں .

۳ دو کتابوں کے بعد رسالوں کے خاص نمبروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں پہلا رسالہ ماہنامہ العطش جموں ہے، میں نے اس سے پہلے اس پرچے کا نام نہیں سنا تھا یہ کوئی شاذ نکلنے والا پرچہ ہوگا اس کے مدیر راج کمار چندن ہیں جو جموں یونیورسٹی میں آزاد کے شاگرد رہ چکے ہیں اس کی جنوری تا اپریل ۸۶ ع کی خصوصی اشاعت جگن ناتھ آزاد نمبر ہے اس کی ضخامت تقریباً ۱۰۴ صفحات کی ہے اس میں ۱۳ مضامین ہیں جو چار زمروں میں ہیں شخصیت، شاعری، نثر نگاری، اقبالیات میں چند منتخب مضامین کا ذکر کرتا ہوں

ڈاکٹر حسن اختر اپنے مختصر مضمون میں لکھتے ہیں کہ آزاد کی شخصیت کی تعمیر پاکستان اقبال اور اردو کی محبت سے ہوئی ہے مضمون نگار آزاد کی نظم «ترانہ پاکستان (ستمبر ۱۹۵۱ ع)» کی طرف توجہ دلاتے ہیں جسے پڑھ کر ان کے بقول یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سچے پاکستانی کا کلام ہے اس کا پہلا مصرع ہے ع اے مری ارض وطن، اے ارض پاکستان سلام (ص ۶) یہ نظم آزاد کے مجموعے «وطن میں اجنبی» کی آخری نظم ہے

یوسف ناظم آزاد کی خاکوں کی کتاب «آنکھیں ترستیاں ہیں» کے بارے میں لکھتے ہیں

«ان خاکوں میں بھی (جد ہو گی) مصنف نے اپنے قلم کو، بے باکی تو چھوڑیے، بے تکلفی کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔» (ص ۱۲)

رسالے کا دوسرا حصہ «شاعری» ہے جس کے چار مضامین میں سے دو ڈاکٹر نارنگ چرن رستوگی کے ہیں، ایک آزاد کی غزل کے بارے میں، دوسرا جموں کی نظموں کے متعلق پہلے مضمون میں رستوگی فراق کی غزل کا ایک غیرمعمولی شعر درج کرتے ہیں ـــ

خدا کو ہر جواں جب یہ جھکے تو فراق پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

تیسرا حصہ «نثر نگاری» ہے جس میں خواجہ احمد عباس نے «آنسوؤں اور قہقہوں کی کتاب» کے عنوان سے خاکوں کے مجموعے «آنکھیں ترستیاں ہیں» کو

سراہا ہے۔ انہوں نے موضوع جاکہ ادیبوں کو پنجابی اور غیر پنجابی میں تقسیم کیا ہے۔ پنجابیوں میں پہلا نام تاجور نجیب آبادی کا ہے حالانکہ ان کی نسبت ہی ظاہر کرتی ہے کہ وہ پنجابی نہیں، یوپی کے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ پنجاب میں آکر بس گئے تھے عباس لکھتے ہیں کہ مولانا صلاح الدین احمد کا جاکہ سب سے زیادہ جذباتی ہے۔ تقسیم کے بعد جب آزاد لاری میں سوار ہوکر ریفیوجی کیمپ سے امرتسر کے لیے چلے تو دل کو گداز اور چشم کو تر کرنے والا آزاد کا یہ بیان ملاحظہ ہو۔

(یہ بس میونسپل کارپوریشن کے قریب جاکر تھوڑی دیر کے لیے رکی میں نے باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا سڑک کے کنارے نقش بہ دیوار سے کھڑے ہیں اور لاہور سے جانے والے مہاجرین سے بھرے ٹرکوں اور بسوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی لپک کر بس کے نزدیک آگئے مجھ سے انہوں نے کچھ کہنا چاہا، اُن کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ بس چل پڑی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے)۔ (ص ۴۱)

دوسرے پنجابی ہندوؤں اور آزاد کے پاکستان سے ہجرت کرنے میں کتنا فرق ہے، دوسرے ہندو شرنارتھی مغربی پنجاب کے مسلمانوں کو قہر و نفرت کی نظر سے دیکھ کر وداع ہوئے تھے۔ آزاد ان کی محبت میں، ان سے بچھڑنے پر غمگین تھے

نثر نگاری کی فصل کا آخری اور رسالے کا سب سے اہم مضمون راج کمار چندن کے قلم سے (جگن ناتھ آزاد سے ایک ادبی ملاقات) ہے ۱۶ صفحوں کا یہ مفصل مضمون آزاد کی ذات و نظریات کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے۔ مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے حسب ذیل بیانات میری دلچسپی کا باعث ہیں

۱ تقسیم ملک سے پہلے وہ اپنے وطن عیسیٰ خیل آخری بار ۱۹۳۵ ع میں گئے۔

اس کے پورے ۵۵ سال بعد ۱۹۸۰ء میں گئے۔ (ص ۵۳)

۲ کرشن چندر کو انعام و اعزاز نہ ملنے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں انعامات Merit یا قابلیت کی بنا پر نہیں ملتے ہیں اور جوڑ توڑ کی بنا پر ہیں۔ کرشن چندر جوڑ توڑ کے فن سے ناواقف تھے۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام پانے والے اکثر لوگ کس طرح Wire Pulling کرتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں۔ میں کس کس کا نام لوں، کس کس طرح سفارشیں آتی ہیں۔ گرچہ یہ انعام پانے والوں میں فراق گورکھپوری اور جگر مرادآبادی ایسے شاعر اور امتیاز علی خاں عرشی ایسے مسلمہ حیثیت کے نثرنگار حضرات شامل ہیں لیکن ان حضرات کو بھی جس طرح ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام ملا، اس کی تفصیل میں بخوبی جانتا ہوں۔ جگر صاحب اور امتیاز علی عرشی تو درویش آدمی تھے، انھیں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ پانے کی کبھی حسرت نہیں رہی ہوگی لیکن ان کے ایوارڈ پانے کی تفاصیل آپ کے سامنے آئیں تو آپ دانتوں میں انگلی داب کے رہ جائیں گے۔ ان حضرات کو تمام قواعد و ضوابط بالائے طاق رکھ کر ایوارڈ دیے گئے لیکن کرشن چندر اور علی سردار جعفری ایسے صف اول کے فنکاروں کو جس طرح ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ کے معاملے میں حلقۂ بیرونِ در رکھنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بھی جگہ ایک المناک داستان ہے۔) (ص ۵٦)

مجھے فراق، جگر اور عرشی کے انعام پانے کی کوئی درونِ پردہ داستان معلوم نہیں۔ ایک دفعہ دلی یونیورسٹی میں انجمن اساتذۂ اردو کی پہلی کانفرنس منعقد ہورہی تھی۔ وہاں استادی ڈاکٹر سید اعجاز حسین سے ملاقات ہوئی۔ انھیں دنوں عرشی صاحب کو ایوارڈ ملنے کا اعلان ہوا تھا۔ اعجاز صاحب نے مجھ سے کہا، یہ ایوارڈ عرشی صاحب کو کیوں ملا، غالب کو ملنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں اس کے لیے کس کس سے کوشش سفارش کی ہوگی۔ میں نے کہا، کیا ایوارڈ کے لیے کوشش بھی کی جاتی ہے؟، اس پر استاد صاحب نے کہا، اور کیا۔ یونہی تو ایوارڈ مل نہیں جاتا۔ عرشی صاحب پر اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ تدوین پر انعام کیوں دیا گیا۔ اس کے بعد سے فکر ہوگئی کہ تدوین کے کاموں پر ایوارڈ

کے لیے غور نہیں کیا جائے گا حالانکہ (دیوان غالب نسخۂ عرشی) جیسی تدوین پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالوں پر بھاری ہے، یہ تحدید نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے قطع نظر میں اعجاز صاحب کے اعتراض سے متفق نہیں۔ میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ عرشی صاحب جیسے درویش صفت عالم نے انعام کے لیے کوشش کی ہوگی۔

۳ راج کمار چندن نے آزاد سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے تعلقات با رسوخ بڑے بڑے افسروں سے ہی زیادہ رہے۔ اس کے جواب میں آزاد نے کہا کہ بنیادی طور پر ان کے تعلقات شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ہیں۔ ان میں افسر بھی ہوسکتے ہیں، غیر افسر بھی چونکہ وہ حکومت ہند کے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز تھے اس لیے تمام افسروں کے ساتھ تعلقات رکھنا ضروری تھا (ص ۵۷)

چندن نے کہا کہ جموں یونیورسٹی میں صدر شعبہ کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ بقول مخمور سعیدی ہوا کے گھوڑے ہی پر سوار رہے یعنی ہوائی جہاز پر بیرون ہند بہت دورے کیے۔ اس پر آزاد نے کہا کہ آپ کا اور دوسرے دوستوں کا یہ خیال غلط ہے جموں یونیورسٹی میں آنے سے قبل بھی وہ ہندوستان اور باہر کی یونیورسٹیوں میں کئی بار جاچکے تھے لیکن پہلے سرکاری نوکری میں بار بار چھٹی نہیں ملتی تھی۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد ایسی کوئی قدغن نہیں رہی بلکہ بعض دفعہ تو ان کی چھٹی کی فائلوں پر وائس چانسلر صاحبان نے ان کے لیے بہت حوصلہ افزا جملے لکھے ہیں۔ (۵۸ - ۶۰)

چندن نے پوچھا کیا بیرونی ملکوں میں اردو پر واقعی کام ہورہا ہے، اس پر آزاد نے اطلاع بہم پہنچائی (امریکا میں مختلف سطحوں پر ۲۲ یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جارہی ہے)، (ص ۶۰)

آزاد نے گوپال متل کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا ہے جس میں فراق کے بارے میں یہ رائے ہے

(فراق کے پاس علم و دیانت کی فراوانی نہیں تھی۔ ان دونوں کی فراوانی صرف ایک شاعر کے پاس تھی جس کا نام اقبال ہے۔۔۔ فراق صاحب میں تیری

اور طراری تو تھی لیکن اس انہماک سے وہ محروم تھے جو علمی مشاغل کے لیے ضروری ہوتا ہے'. (ص ٦٦ ـ ٦٥)

فراق پر آزاد صاحب کے مضمون کی میں نے ایک خط میں جس طرح داد دی تھی اس کو پسند فرما کر آزاد نے میری عزت افزائی کی ہے (ص ٦٦)

اقبالیات کے حصے میں ایک مختصر مضمون عبداللطیف اعظمی کا ہے جو انہوں نے آزاد کی کتاب 'اقبال اور مغربی مفکرین' پر لکھا ہے. مضمون نگار نے بعض جگہ آزاد کے بیانات سے اختلاف کیا ہے، بالخصوص حوالوں کے ناکافی ہونے پر معترض ہیں

مضمون نگاروں میں کچھ دوسرے مشاہیر بھی ہیں مثلاً انتظار حسین، خواجہ احمد عباس، ملک زادہ منظور احمد اور راج بہادر گوڑ معمولی وسائل کے ایک غیر معروف رسالے کو دیکھتے ہوئے یہ خصوصی نمبر قابل داد ہے گو اس میں کوئی بھی غیر معمولی مضمون نہیں بجز انٹرویو کے. اس شمارے میں آزاد کی تصنیفات و تالیفات اور انعامات کی فہرست پہلی بار نظر آتی ہے جو بعد کے مجموعوں میں اور زیادہ مفصل ہوجاتی ہے.

آزادیات کا چوتھا مجموعہ سہ ماہی 'لمحے لمحے' بدایوں کا جگن ناتھ آزاد نمبر بابت جولائی ۱۹۸٦ ع تا فروری ۱۹۸۸ ع ہے آزاد سے متعلق ساتوں مجموعوں میں یہ ضخیم ترین ہے یعنی پورے ٦۰۰ صفحوں پر محیط اس کے پہلے چار حصے مضامین پر مشتمل ہیں.

شخص و عکس ـ شعریات ـ نثریات ـ اقبالیات

اس کے آگے 'اقبال نمائش' کے عنوان سے آزاد کی زبانی اس نمائش کی کہانی ملاقاتیں کے عنـــوان سے تین پاکستانی رسالوں میں انٹرویو، منظومات کے عنوان سے آزاد سے متعلق نظمیں، 'اپنی محفل، اپنے دوست' کے عنوان سے آزاد کے نام چند مکتوبات اور آخر میں انتظاریہ کے عنوان کے تحت

ڈاکٹر مظہر اعظمی کا مضمون ہے۔

مجموعے میں کل ٥٢ مضامین ہیں جن میں سے ٢٠ پہلے کے مجموعوں میں سے لیے گئے ہیں۔ ٣٢ نئے مضامین میں سے۔ چند کے بعض اندراجات کی طرف اشارہ کروں گا

المنظر میں پانچ صفحوں میں سوانحی خاکہ تھا۔ لمحے لمحے میں سب سے پہلے محمد اسداللہ داسی لیکچرر اردو ویمنز کالج جموں کی مرتب کردہ مفصل توقیت ہے جو ٣٣ صفحوں کی ہے اس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں

بایوڈیٹا - تصنیفات و تالیفات - جگن ناتھ آزاد کے متعلق کتابیں - ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں توسیعی اور خصوصی خطبات ٣٥ ان خطبات کے علاوہ سیمناروں میں پڑھے ہوئے مقالات ١٢٠ علمی و ادبی انجمنوں اور اداروں کی رکنیت ٣٤ باہر کے ملکوں میں براڈکاسٹ اور ٹیلی کاسٹ پروگرام ١٨۔ انعامات و اعزازات ٤٢

یہ توقیت آزاد کی زندگی اور اکتسابات سے متعلق صحیح صحیح معلومات کا گنجینہ ہے اب ایک دوسرے مضامین کے بعض نکات

غلام رسول ریبرو (آئی اے ایس) سری نگر نے اپنے مضمون میں گرفت کی کہ واقف نے اپنی مرتبہ کتاب میں آزاد کا سن پیدائش ١٩٠٨ع لکھا ہے حالانکہ وہ ١٩١٨ میں پیدا ہوئے ریبرو نے واقف کے مبینہ غلط اندراج کے صفحے کا حوالہ نہیں دیا میں مجموعے کے دیباچے میں ڈھونڈتا رہا۔ وہاں نہ ملا واقف نے مجموعے کے آخری حصے میں آزاد کی نظم گوئی پر جو مضمون لکھا ہے اس کی تمہید میں ص ٢٢٣ پر آزاد کی کتاب (مہرے گزشتہ روز و شب) سے اقتباس دیا ہے جس میں تاریخ ولادت ٥ دسمبر ١٩٠٨ع لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سہو کتابت ہے ریبرو نے ایک مفید اطلاع دی ہے کہ آزاد جب محکمۂ اطلاعات میں ملازم تھے تو انہیں بہت دکھ تھا کہ وہ کہاں افسری کے جھمیلے میں پھنس گئے۔ ایسے ماحول کی تمنا کرتے تھے جس میں وہ تحقیق کا کام کرسکیں۔

یونیورسٹی میں آکر آزاد کو یہ ماحول میسر ہوگیا۔ اس سے پہلے سرکاری ملازمت کے دنوں میں رات کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے تو یہ تحقیق و مطالعہ کا کام دو تین بجے صبح تک کرتے۔ صبح جب دفتر جاتے تو ایسے لگتا جیسے کوئی مجرم عدالت میں حاضری کے لیے آیا ہو۔ (ص ۵۹)

عقیل عیسیٰ خیلوی[1] نے اپنے مضمون (جگن ناتھ آزاد) میں لکھا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں آزاد اپنی زاد بوم عیسیٰ خیل اور ضلع کے صدر مقام میانوالی بھی گئے۔ دہلی پہنچ کر ایک بیان میں بتایا کہ میرا یہ سفر آنسوؤں کی وادی کا سفر تھا (ص ۹۳) میں ہجرت کے کرب سے واقف نہیں ہوں۔ اپنے مولد سے باہر جہاں رہا، اپنی مرضی سے رہا لیکن اس خاک سے کبھی رشتہ منقطع نہیں کیا۔ سال دو سال میں جاتا رہتا تھا۔ بہر حال تھا تو اپنے ملک میں۔ آزاد نے ۲۹ سال کی عمر میں نہ صرف اپنی زاد بوم چھوڑی بلکہ اپنا دیار مالوف بھی۔ یہ کوئی بچپن کی عمر نہیں۔ اپنی مرضی سے وطن چھوڑنا اور بات ہے، حالات کی تندی کے سبب اپنے وطن میں رہنے پر قادر نہ ہونا دوسری بات۔ اس کا درد آزاد جیسا مہاجر ہی جان سکتا ہے۔

افتخار نسیم نے شکاگو کے ایک مشاعرے کے بارے میں لکھا ہے:
جمیل الدین عالی نے اپنا مشہور ترانہ (جیوے جیوے پاکستان) سناتے ہوئے کہا کہ میں ہندوستانیوں سے توجہ نہیں، پاکستانیوں سے کہوں گا کہ وہ ترانے میں میرا ساتھ دیں۔ جب آزاد مائک پر آئے تو انہوں نے کہا کہ میں اس ہندوستانی کو ہندوستانی ماننے کو بھی تیار نہیں جو (جیوے جیوے پاکستان) کے نعرے کا ساتھ نہیں دیتا (ص ۹۸) میں آزاد کی اس وسیع القلبی کی تائید کرتا ہوں۔ کاش انہوں نے اہلِ پاکستان کو بھی تلقین کی ہوتی کہ وہ (جیوے جیوے ہندوستان) کا ترانہ بھی گایا کریں۔

روش حسن کاظمی شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی کے مضمون کا عنوان ہے (جگن ناتھ آزاد کی طویل نظمیں)۔ اس میں لکھتے ہیں:

وطن میں اجنبی بھی آزاد کی طویل نظم ہے جس میں آزاد نے نظموں،

---

۱ عیسیٰ خیل سے صفت نسبتی عیسیٰ خیلی ہوگی عیسیٰ خیلوی نہیں

غزلوں، قطعات اور رباعیات کو بھی نظم کی تکمیل میں استعمال کیا ہے ؛
(ص ۱۸۹)

وہ اپنی تائید میں عبدالمجید سالک کا قول نقل کرتے ہیں ۔

«اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن جو روح مسلسل ان میں جاری و ساری ہے اس اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی طویل نظم ہے جس کے مختلف حصے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں ؛ (ص ۹۰-۱۸۹)

میری رائے میں «وطن میں اجنبی» ہرگز ایک نظم نہیں ، مختلف آزاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے مضمون نگار لکھتے ہیں ۔

«اردو کی طویل نظموں میں یہ تکنیک عام طور پر استعمال نہیں کی گئی ہے لیکن اردو کی یہ ایک ایسی نظم ہے جس کا ہر جز نظم ، غزل ، قطعہ ، رباعی خود اپنی جگہ مکمل ہے ؛ (ص ۱۹۰)

اگر نظم ایک زنجیل کا نام ہے تو اقبال کی ضرب کلیم ، بال جبریل ، جوش کی شعلہ و شبنم ، چکبست کی کلیات «صبح وطن» وغیرہ بھی واحـــد طویل نظمیں کہلانے کی مدعی ہوں گی کیونکہ ان میں داخلی ہم آہنگی و موضوعی یک رنگی ہے شعریات کی اصل میں عـــلام رسول ریہرو آئی ۔ اے ایس کا مضمون «پھوں کی نظمیں» ایسے رنگ کا انوکھا مضمون ہے کہ پورے کا پورا مختلف اخباروں میں لکھنے والوں کے اقتباسات لے کر ترتیب دیا ہے ۔

ایک بہت دلچسپ اور اہم مضمون ہے «بھارت کے مسلمان ، ایک نظم ، ایک کہانی» ۔ اس میں آزاد کی اس تاریخی نظم کے تعلق سے متعدد حضرات کے تاثر اور کئی شعرا کی جوابی نظمیں جمع کردی گئی ہیں ۔ تاثر نگار حضرات میں متعدد عمائد شامل ہیں ۔ مضمون کے فوراً بعد آزاد کی پوری نظم دے دی گئی ہے جملہ متعلقات ص ۲۹۵ سے ۳۲۴ تک محیط ہیں انہیں پڑھنے سے نظم کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے

اس کے آگے نثریات کا حصہ ہے جس میں آزاد کی مختلف نثری کتابوں پر بہت سے اہل قلم نے اظہار خیال کیا ہے۔ سب سے زیادہ مضامین ان کی شخصیت نگاری اور مرقعوں کے مجموعے (آنکھیں ترستیاں ہیں) کے بارے میں ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مضمون (جگن ناتھ آزاد اور شخصیت نگاری) میں تقسیم ملک کے ایام کی داستان بہ زبان آزاد بیان کرتے ہیں۔ (آنکھیں ترستیاں ہیں) میں صلاح الدین احمد کے تذکرے میں ہے

(۱۹۴۷ ع کے ذکر سے یاد آیا، میرا لاہور چھوڑنے کا پروگرام بہت جلدی میں بنا تھا۔ اس قدر جلد لاہور چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں تھا بلکہ وہیں مستقل قیام کا تھا۔ اسی عالم میں تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی رات کو میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانۂ پاکستان سنا

اے سرزمین پاک
روشن ہے کہکشاں سے آج تیری خاک

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ پہلا ترانۂ پاکستان تھا جو پاکستان کے نقشۂ عالم پر نمودار ہونے کے ساتھ ہی ۱۴ اگست کو رات کے بارہ بجے سننے والوں تک پہنچا) (ص ۳۳۲)

بقول ۱۳ اور ۱۴ اگست کی درمیانی رات کو ریڈیو سے نشر ہوا کہ ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات کو؟ میرا خیال ہے آخرالذکر صحیح ہے کیونکہ ۱۴ اگست کے دن میں تو برطانوی راج موجود تھا۔ دونوں مملکتوں کی آزادی ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب کو بارہ بجے عمل میں آئی۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر سلیم اختر تلوک چند محروم کے اسلامی شعار کے ثبوت میں لکھتے ہیں کہ جب محروم کی دو سالہ بچی کا انتقال ہوا تو بقول آزاد اس بچی کی موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا (ص ۳۳۳)

سلیم اختر اور آزاد کو یہ معلوم نہیں کہ ہندوؤں میں عام رواج ہے کہ بہت

چھوٹے بچوں یعنی دو سال تک کے خورد سالوں کی لاش جلاتے نہیں، دفن ہی کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (کافر ہندی، مسجد قرطبہ میں) کے عنوان والے مضمون میں آزاد کی زبانی ان کی زیارتِ مسجدِ قرطبہ کی کیفیت بیان کرتے ہیں

(اب میں وہاں اذان تو کیسے دیتا اور یہ فرض عہد سے قبل علامہ اقبال خود ہی ادا کر چکے تھے ہاں یہ مصرعہ ضرور زبان پر آگیا تھا

ع کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق

(ص ۴۱ ـ ۲۴۰)

یہ مصرع اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کا ہے۔ آزاد کی زبانی (کافر ہندی) کی ترکیب لطف دے گئی آزاد کی اس کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے دین کا کس حد تک احترام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے (عصری ادب) میں آزاد کے تنقیدی مضامین کے مجموعے (نشانِ منزل) پر مختصر تبصرہ کیا ہے جس میں کچھ مشاہدات قابلِ ذکر ہیں

۱ اقبال پرستی ان مضامین کا وصف بھی ہے اور کمزوری بھی۔

۲ اقبال اردو شاعروں میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، ہومر اور ورجل، گوئٹے اور شیکسپیر کے قد و قامت تک نہیں پہنچتے۔

۳ آزاد نے جوش ملیح آبادی سے، اقبال پرستی کے جوش میں، خاصی زیادتی کی ہے۔

۴ (جواہر لعل نہرو کا ادبی مرتبہ اور ترقی پسند شاعری کے فن میں (تعمیری ادب) اور پنج سالہ منصوبوں کی فتوحات کو نظم نہ کرپانے کا الزام ترقی پسندوں پر عائد کرنے کی کوشش (صفحہ ۸۳) پڑھ کر یاد آتا ہے کہ آزاد حکومت ہند کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر رہ چکے ہیں اس لیے حکومت وقت کی وکالت سے بے خبر نہیں رہتے۔)

فٹ نوٹ میں مدیر نے آخری الزام کا جواب دیا ہے

مضامین کا چوتھا زمرہ اقبالیات ہے۔ اس کے شروع میں ایک بہت مختصر مضمون ڈاکٹر خلیق انجم کا "اقبال اور مغربی مفکرین" ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کی صورت حال کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا

"اردو دشمن عناصر نے اقبال کو پاکستانی شاعر قرار دے دیا ہمارے نقاد اقبال پر قلم اٹھاتے ہوئے ڈرنے لگے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اقبال کو تقریباً نکال دیا گیا اس دور پر آشوب میں اگر کوئی شخص نتائج سے بے نیاز ہوکر اقبال سے اپنی محبت کا برملا اظہار کرتا رہا تو وہ جگن ناتھ آزاد ہے"
(ص ۳۷۰)

میرا خیال ہے کہ اقبال کو پاکستانی شاعر قرار دینے کا اقدام ہندوستان کے اردو دشمن عناصر سے زیادہ پاکستان کے اردو دوست حلقوں نے کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کچھ اور شدت کے ساتھ یہی خیالات اپنے مرتبہ مجموعے "جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)" کے حرف آغاز میں ظاہر کیے جہاں "تقریباً" کا لاحقہ نکال کر کہہ دیا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اقبال کا کلام خارج کردیا گیا تھا۔
(ص ۱۶)

ڈاکٹر خلیق انجم نے آزاد کی اخلاقی جرأت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ اقبال کو تمام یونیورسٹیوں کے نصاب سے نکال دیا گیا، درست نہیں معلوم ہوتا میں نے ان یونیورسٹیوں کے بارے میں تحقیق کی جن سے میرا کوئی تعلق رہ چکا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر محمد عقیل نے مجھے لکھا کہ ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے میں آزادی سے پہلے اقبال کو جس طرح پڑھایا جاتا تھا، آزادی کے بعد بھی اسی طرح پڑھایا جاتا رہا۔ آزادی سے پہلے الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے میں جدید شاعری کے پرچے میں اقبال کی دو کتابیں بانگ درا اور بال جبریل تھیں۔ عقیل صاحب کے مطابق ۱۹۵۰-۵۲ ع میں ایم اے میں ان دو کے علاوہ ضرب کلیم کا تفصیلی مطالعہ بھی شامل کرایا گیا۔ ایم اے فارسی کے نصاب میں مثنوی اسرار خودی اور "پس چہ باید کرد

اے اقوام مشرق، شامل رہیں ایم اے فلسفہ میں اسلامی فلسفے کا ایک پرچہ تھا۔ اس میں اقبال کے چھے لیکچر حوالے کی کتابوں میں شامل تھے

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بتایا کہ آزادی سے پہلے آگرہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں خصوصی مطالعے کے لیے دو شعرا، غالب یا اقبال میں سے کسی ایک کو لینا ہوتا تھا آزادی کے بعد بھی یہ پرچہ برقرار رہا۔ آگرہ یونیورسٹی کی ذریات میں جتنی یونیورسٹیاں وجود میں آئیں انھوں نے بھی یہ دونوں شعرا رکھے ۱۹۵٦ ع میں جب ہم نے وکرم یونیورسٹی اُجین کا نصاب بنایا تو ایم اے میں اقبال کی بالِ جبریل شامل کی۔ عبدالقوی دسنوی کی رائے میں بھی اسکول اور کالجوں کے نصاب میں اقبال کی نظمیں ضرور رہتی تھیں

(لمحے لمحے) کے زمرۂ اقبالیات میں دوسرا اور سب سے اہم مضمون رفیع الدین ہاشمی کا ہے انھوں نے اقبال پر آزاد کی ۱۰ کتابوں اور دوسرے کاموں کی نشان دہی کی ہے آزاد کی کتاب (اقبال اور مغربی مفکرین) کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس میں ۳۸ صفحوں کا مفصل مقالہ (اقبال اور کارل مارکس) بہترین ہے، وہ مزید مطلع کرتے ہیں کہ تیسرے ایڈیشن میں مصنف نے ۵۳ صفحوں کے مبسوط مقالے (اقبال اور آئن سٹائن) کا اضافہ کیا ہے جو اُن کی وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مجھ سے اس موضوع پر لکھنے کو کہا جائے تو میں صرف ایک جملہ لکھ سکوں گا۔

(میں اقبال اور آئن سٹائن کے تعلق سے کچھ نہیں جانتا)

رسالے کا ایک اہم جزو (اقبال نمائش) کی تفصیل ہے جو ص ۴۲٦ سے ص ۴۹۲ تک پھیلی ہوئی ہے اس میں نمائش کے مآخذ، تیاری، مشکلات، معاونین، تقریبات اور نمائش کی تصاویر کی وہ جزئیات دی ہیں جن سے گویا نمائش کو دیکھے بغیر ہی دیکھ لیا جاتا ہے نمائش کل ۴۷٦ تصاویر پر مشتمل تھی، میں اس نمائش کو دیکھ چکا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی جامع نمائش آراستہ کرنا آزاد کا ایسا کارنامہ ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ وہ اس پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ اردو میں کسی دوسرے ادیب کی ایسی

نمائش نہ تیار ہوئی نہ ہونے کی امید ہے۔ ایسے کام جذبِ دل کے بغیر سرانجام نہیں ہوتے۔ کسی دوسرے ادیب کا قدرداں وہ جذبہ کہاں سے لائے گا جو آزاد کے دل میں اقبال کے لیے ہے۔

اس کے آگے (ملاقاتیں) کے عنوان سے پاکستان کے تین اخباروں میں چھپے آزاد کے انٹرویو، پھر معلومات اور خطوط ہیں۔ آخر میں انتظاریہ کے عنوان سے مظہر اعظمی کا مضمون (سخن دل نواز کا عالم شاعر، جگن ناتھ آزاد) ہے۔ مضمون بہت مفصل اور اعلیٰ درجے کا ہے، اس مجموعے کے دو تین اچھے مضامین میں اس کا شمار کیا جائے گا لیکن اطناب کے خوف سے میں اس پر مزید نہیں لکھ سکتا

آخر میں صرف یہ کہوں گا کہ (لمحے لمحے) کا یہ شمارہ آزاد کے شایانِ شان ہے۔ کتنی محنت سے کتنا زیادہ مواد جمع کرکے ترتیب دیا گیا ہے کاش اس کے ظاہر کی طرف بھی توجہ کی ہوتی، کاغذ خراب، کتابت و طباعت ناقص، یہی مواد نفیس کاغذ، آفسیٹ کی طباعت، مضبوط جلد اور دلکش گرد پوش کے ساتھ پیش کیا جاتا تو اس کی قیمت بہت بڑھ جاتی۔ قیمت سے مراد ہے صفاتی قیمت۔

(باقی آئندہ)

• • •

اقبال کی نظر میں تہذیبِ فرنگ

از

محمد بدیع الزماں، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ

اقبال کو مغرب کی تہذیب اور اس کی سیاست کے ساتھ مغرب کے نظام تعلیم کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے وہ مشرقی اقوام پر مغرب کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی یلغار کے خطروں اور ان کے ممکنہ اثرات سے بھی نہ صرف بخوبی واقف تھے۔ بلکہ وہ عالمی سطح پر ان کے اثرات و نفوذ کے نتیجوں میں زندگی اور معاشرے کی تبدیلیوں کا علم بھی رکھتے تھے۔

اقبال جس قدر دروں بیں واقع ہوئے تھے اُس سے کہیں زیادہ خارجی حالات پر اُن کی نظر رہا کرتی تھی، اس لئے کہ وہ جہاں بیں کے قائل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں ۱۹۰۵ع سے اپنے تین سالہ قیام یورپ میں اقبال کی چشم نگراں وا رہی۔ اُنہوں نے فرنگی تعلیم، فرنگی ریاست، حکمت، مدنیت، تمدن اور فکر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ اُن کا مطالعہ عمومی نوعیت کا نہ تھا۔ یہ ایک دیدہ ور اور منفرد شخصیت کا مطالعہ تھا، اور ایک منفرد ذہنی رویہ اس کے لئے شرطِ پیشیں کا حکم رکھتا تھا۔ یہ وہ شخصیت تھی جو مشرق کی روحانی اور اخلاقی اقدار سے سیراب تھی، اور اس سے بھی بڑھ کر اسلامی فکر سے، جس کا سرچشمہ نور قرآنِ حکیم ہے۔ لیکن یہ شخصیت موجودہ صدی میں پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ع) کے پس منظر میں مادی اور مشینی تہذیب کے یلغار کے نتیجے میں پراگندگی اور شکست کے خطرات سے بھی دوچار تھی۔ تاہم اقبال کی شخصیت داخلی خلقی توانائیوں کا احساس کرکے ان خطرات سے لاتعلق ہوکر اپنے وجود کی تشکیل جدید کے ایقان سے سرشار تھی۔ قرآن نے اقبال کے تخئیل و تصور اور فکر و اندیشہ کو پرواز کی غیر المعقول اور معجزانہ طاقت عطا کی تھی، اقبالیات اسی قرآنی دریافت کی تفسیر و تعبیر ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (اقبالیات، جنوری ۱۹۷۹ع میں یوں رقمطراز ہیں

(سب جانتے ہیں کہ اقبال نے وہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے

نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یعنی تاریخ، یعنی ادب، یعنی اقتصادیات، یعنی سیاسیات، یعنی قانون اور یعنی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اس کا سمندر پئے بیٹھا تھا پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان، اپنے اصولِ تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے لیکن اس کے باوجـــود اس شخص کا کیا حال تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اُترتا گیا اتنا ہی مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہوچکا ہے اور قـــرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا، قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہوگیا تھا کہ اس دور کے علماء دین میں بھی مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو فنا فی القـــرآنیت میں اس امام فلسفہ اور ایم۔ اے۔ (کیمبرج) پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (جرمنی) اور بار ایٹ لا (لندن) سے لگا کھاتا ہو۔،

ان ساری باتوں کے پس منظر میں اس مضمون میں نظریۂ مغرب کے تحت مختلف ذیلی عنوانات جیسے مغـــربی مدنیت، تمدن، سیاست، حکمت اور تعلیم جیسے موضوعات پر اقبال کے نظریوں پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ ان سب ذیلی عنوانات کے تحت جو نظامِ اقدار ہمیں ملتا ہے وہ حقیقتاً اقدار کا کوئی انفرادی تصور نہیں بلکہ ان تمام اقدار سے مل کر اقدار کی ایک ہی تقدیر اقبال کے کلام میں اُن کے نظریۂ مغرب کے تحت ملتی ہے۔ یہ سبھی اقدار ایک نئے سماج کے لئے بشارت کی

حیثیت رکھتی ہیں اور انفرادیت کے اسی رجحان میں اقبال کی عظمت پوشیدہ ہے۔

(۱) فرنگی مدنیت :

اقبال تہذیبِ حاضر اور فرنگیوں کی مدنیت کے سخت مخالف تھے اس لئے کہ ان کی بنیاد ہی مادیت اور انکارِ خدا پر رکھی گئی ہے۔ اس نظریہ نے انسانوں کو ہر اُس چیز کی آزادی عطا کر رکھی ہے جو شریعت اسلامیہ کی نفی کرتی ہے۔ یہ مدنیت اسلام کی ان ساری ممنوعہ باتوں کو صرف جائز ہی قرار نہیں دیتی بلکہ اُنہیں معیار ترقی قرار دیتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر فکر و عمل کی یہ آزادی، جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے، بے حیائی اور بے دینی کی لعنت میں گرفتار کر کے اُنہیں نفسانی خواہشات کا غلام بناتی ہے۔ اسی نکتہ پر ’’بالِ جبریل‘‘ کی غزل ۱۴ (دوم) میں اقبال کہتے ہیں ؎

یہ تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

اسی نکتہ پر تجارت کا تلازمہ باندھ کر اقبال نے مسلمانوں کو ’’بالِ جبریل‘‘ کی غزل ۲۳ کے درجِ ذیل شعر میں یہ باور کرایا ہے کہ مغرب، اپنے مادی نظریہ کے تحت، اسلامی شعار کو کساد یعنی کم مایہ اور کم قیمت قرار دیتا ہے مگر بقول اقبال اسلامی شعار لائقِ تحسین و آفرین متاعِ ہنر ہے ؎

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ وہ شئے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال، ایک اور موقع پر، ’’بالِ جبریل‘‘ کی غزل ۴۳ کے درجِ ذیل شعر میں اس تہذیبِ حاضر کو ’’ایوانِ فرنگ‘‘ کا نام دیتے ہوئے یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ چونکہ یہ مدنیت مادیت پر مبنی ہے اس لئے اس میں نہ پائیداری ہے اور نہ زندگی۔ اس لئے ’’پیرِ میخانہ‘‘ یعنی ایک مردِ مومن یا عارف کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہونی چاہیئے ؎

پیرِ میخانہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ سست بنیاد بھی ہے، آئینۂ دیوار بھی ہے

اقبال تہذیب و تمدن کے نظریۂ مغرب سے اس لئے نالاں تھے کیونکہ یہ

تہذیب انسانوں کو روحانیت اور اخلاقِ حسنہ سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب انسان کی روح ناپاک ہوتو اس میں نہ پاک ضمیر پیدا ہوسکتا ہے، نہ بلند خیال اور نہ ذوق لطیف۔ (ضرب کلیم) کی نظم (مغربی تہذیب) میں کہتے ہیں ؂

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہو ناپید ۔۔۔ ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبال فرنگی مدنیت کو ایک لعنت قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کی روح میں نہ پاکیزگی ہے، نہ ہمدردی اور نہ خیر خواہی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب (جمعیت اقوام) نے ملک شام کو فرانس کی تحویل دے دیا تو اس فرنگی مدنیت نے اُس ملک کو جس نے حضرت عیسیٰ جیسے نبی عفت پیدا کیا تھا اُسے اپنی تہذیب کی تین بڑی لعنتیں دیں۔ شراب، جوا اور فاحشہ عورتیں اور یہ لعنتیں آج ہر اُس ملک میں ہیں جو اس مدنیت کا دلدادہ ہے۔ (ضرب کلیم) کی نظم (یورپ اور سوریا) میں فرنگی مدنیت کے فتوحات پر کہتے ہیں ؂

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا ۔۔۔ نبی عفت و غم خواری و کم آزادی
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے ۔۔۔ مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

اور پھر (بالِ جبریل) کی نظم (ابلیس) میں کہتے ہیں ؂

بیکاری و عریانی و مئے خواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

(فرنگی مدنیت) اس مفسدانہ مادی نظریہ کی وجہ اقبال (ضربِ کلیم) کی نظم (دامِ تہذیب) میں یہ بتاتے ہیں ؂

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے ۔۔۔ ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اُس نے ۔۔۔ بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار

(تہذیب حاضر) کو (حیات تازہ) سے موسوم کرتے ہوئے (بانگِ درا)

کی نظم «تہذیبِ حاضر» کے درج ذیل شعر میں اس مدنیت کے مفسدات پر اقبال اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا — رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

یہ کہ یہ تہذیب سراسر مادہ پرستی اور انکار خدا پر مبنی ہے اس پر «بالِ جبریل» کی غزل ۱ (دوم) میں کہتے ہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلاّ

«لا سے مراد «لا الٰہ» ہے اور «اِلاّ» سے مراد «اِلاّ اللہ» ہے۔ یورپ والوں کے ہاتھوں میں «پیمانۂ اِلاّ» نہ ہونے کی وجہ اگلے ہی شعر میں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ اسے زخمہ ور یعنی یورپ کے اربابِ سیاست کی تیز دستی نے دبا رکھا ہے۔ اگلا شعر یہ ہے ؎

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے — بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اقبال نے اپنے سارے کلام میں بار بار اقوام مشرق، جن میں ساری دنیائے اسلام ہے، کی کوتاہ بینی پر ماتم کیا جو مغربی تہذیب و تمدن کو اپنے امراض کی دوا سمجھ کر اُس کی تقلید کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کا کہنا تھا کہ جو تہذیب خود مغربی اقوام کو تباہی سے نہ بچا سکی وہ ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے اسی نکتہ پر «ضربِ کلیم» کی نظم «اقوام مشرق» میں تاسف کرتے ہیں ؎

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو — آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اقبال «فرنگی مدنیت» اور «اسلامی مدنیت» کے فرق کو رقص کی مثال دے کر ذہن نشین کراتے ہیں جو «فرنگی مدنیت» میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اقبال کے نزدیک رقص کی دو قسمیں ہیں، ایک جسم کا رقص جس

سے عارضی طور پر انسان لطف اندوز تو ہوجاتا ہے۔ مگر یہ ہوسناکی کی ترغیب دیتا ہے اور اس کا خمار بہت جلد اُتر جاتا ہے۔ دوسری قسم روح کا رقص ہے جو ساری کائنات کو گردش میں لاسکتا ہے اور اسی میں دینِ اسلام کی حقیقت مضمر ہے کیونکہ دینِ مصطفےٰ کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ مسلمان کی روح رقص کرنے لگے۔ اقبال اپنے فارسی کلام (جاوید نامہ) کے آخری باب میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں ؎

رقصِ تن در گردش آرد خاک را رقصِ جاں برہم زند افلاک را
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
رمزِ دینِ مصطفےٰ گویم ترا ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

اسی موضوع پر (ضربِ کلیم) کی نظم (رقص) یوں ہے ؎

چھوڑ یورپ کے لئے رقصِ بدن کے خم و پیچ روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

(۲) آزادیِ نسواں:

فرنگی تہذیب و تمدن میں آزادیِ نسواں بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے جہاں ایک مہذب معاشرہ کہلایا جانے کے لئے شرم و حیا اور غیر مردوں اور غیر عورتوں سے کھلے عام جنسی اختلاط کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مگر اقبال کے پیش نظر سورۃ النور ۲۴ اور سورۃ الاحزاب ۳۳ کے رکوع ۴ اور ۵ کی آیات تھیں۔ ظاہر ہے وہ ایسی خلاف شرع بے حیائیوں کو مسلم معاشرے کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے اس لئے کہ مغرب کا شرم و حیا کے معاملے میں بھی مادی نظریہ ہی مقدم ہے۔

اقبال ۱۹۳۳ع میں اسپین گئے جہاں مسلمانوں نے ۷۵۶ع تا ۱۴۹۲ع حکومت کی مگر جہاں آج ایک کلمہ گو نہیں وہاں اقبال نے ہسپانیہ کی عورتوں میں حسنِ ظاہری کی حد درجہ دلکشی دیکھی اور وہیں قرطبہ میں اس حسنِ ظاہری اور اُن کے مفاسد پر درج ذیل اشعار قلمبند کئے جو (بالِ جبریل) کی غزل ۱۳ (دوم) میں شامل ہیں ؎

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بر کاب
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

اقبال اس حسن ظاہری کو "جلوہ ہائے پا بر کاب" قرار دیتے ہیں کیونکہ حسن ظاہری کی یہ کشش انسان کو اعلیٰ روحانی مقاصد سے غافل کردیتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ حسن اس کے دل و نظر کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ اس کو ثبات نہیں، پس عقلمند آدمی اس فانی لذت کے لئے راحت عقبیٰ کو قربان نہیں کرسکتا اس لئے اقبال مسلمانوں کو ان کی عارضی لذتوں میں منہمک نہ ہونے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک یہ حسن ظاہری، زندگی کے سمندر میں، بمنزلہ گرداب (بھنور) کے ہے اور ہر عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل و نظر یعنی دین و ایمان کو اس بھنور سے بچائے۔

اقبال مغربی عورتوں کے اس حسن ظاہری سے مشرقی اقوام کے متاثر ہونے پر 'بال جبریل' کی نظم 'پیر و مرید' میں اپنے پیر و مرشد مولانا روم سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ ؎

ہے نگاہ خاوراں مسحورِ غرب
حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب

تو مولانا جواب دیتے ہیں ؎

ظاہر نقرہ گر سپید است و نو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو

اقبال مولانا روم کا یہ شعر جواباً نقل کرکے یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ یہ حسن ظاہری چاندی کی طرح اُجلا اور سفید ضرور ہے لیکن اس کے مس کرنے سے ہاتھ اور لباس دونوں کالے ہوجاتے ہیں یہی حال ان مغربی عورتوں کا ہے۔ ان کا ظاہر بہت دلکش ہے مگر باطن یعنی قلب سیاہ ہے۔ اس طرح اقبال اس حسن ظاہری کو، جو مغربی تہذیب کی پروردہ ہے، کثافت باطنی سے تعبیر کرتے ہیں جس میں روحانی اقدار کا فقدان ہے۔

اقبال اس آزادیٔ نسواں پر 'ضربِ کلیم' کی نظم 'خلوت' میں، جو اس

مجموعہ میں (عورت) کے باب میں ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ وہی قطرۂ آبِ نیساں گوہر بنتا ہے جو صدف کی آغوش میں پنہاں ہوجاتا ہے۔ یعنی جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ عورتیں اپنے جسم کی نمائش کرکے اپنی روح کی تربیت سے غافل ہیں۔ کہتے ہیں ؎

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے　　روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے　　ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے　　وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و لیکن　　خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

(۲) مغرب کا مشینی و سرمایہ دارانہ نظام

اقبال مشرق کے مشینی نظام کے بارے میں ایک متوازن اور استدلالی نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ علاوہ ازیں مشینی و سرمایہ دارانہ دونوں نظاموں کے تدریجی ارتقا پر بھی گہری نظر رکھتے تھے کیونکہ اِس نظام کا قیام دراصل تہذیبی ارتقا سے مربوط ہے اور اسے بڑھتی ہوئی انسانی ضروریات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے نزدیک مشینی نظام کی خرابی یہ ہے کہ یہ اخلاقی اور روحانی اقدار کی نفی کرکے مادی ترقی کو اپنا مطمحِ نظر بناتا ہے اور یہ خرابی خود مشین کی نہیں بلکہ انسان کی ہے، جو مشین کو غلط کاروں کے لئے استعمال کرتا اور مشین کا غلام ہوکر رہ جاتا ہے۔ اقبال مشین کے خلاف نہیں، وہ مشینی تہذیب کے خلاف ہیں۔ وہ اس تہذیب کے فیوض و برکات کے قائل ہیں لیکن اس تہذیب کے دعویداروں کو فیضانِ سماوی سے محروم سمجھتے ہیں۔

اس مشینی تہذیب کو (بحرِ ظلمات) کا نام دیتے ہوئے اسے (چشمۂ حیوان) سے محروم قرار دیتے ہیں۔ (بالِ جبریل) کی نظم (لینن) کے درج ذیل اشعار میں اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام اور مشینی تہذیب، مغرب کی اخلاقِ حسنہ اور نیکی سے محرومی اور روحانیت کے فقدان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ؎

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی　　مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال نے مغرب کے اس سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت "ارمغانِ حجاز" کی درج ذیل نظم "دوزخی کی مناجات" میں یوں کی ہے ؎

اس دیرِ کہن میں ہیں غرض مند پجاری — رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود — قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس — ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانۂ آباد
تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے — سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد
یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت — جو کچھ ہے، وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پر سوز — سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

اقبال نے اس سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت "ضربِ کلیم" کی نظم "کارل مارکس کی آواز" میں کارل مارکس کی زبانی اس طرح کرائی ہے ؎

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی، یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

اقبال کو کارل مارکس اور اشتراکیت سے جو کچھ دلچسپی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے فلسفہ کے بعض اصول اسلامی اصولوں سے جزوی مشابہت

رکھتے ہیں مثلاً دونوں سرمایہ داری کے دشمن ہیں، ملوکیت کے دشمن ہیں، کلیسائی نظام کے دشمن ہیں، دونوں محنت کش طبقے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور دونوں طبقہ واری کشمکش سے معاشرہ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے مارکس کے فلسفہ یا معاشی نظام پر اس شعر میں بہت جامع تبصرہ کیا ہے ؂

دیں آں پیغمبر حق ناشناس ۔۔۔۔۔ بر مساوات شکم دارد اساس

اور پھر "ارمغان حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ؂

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اگر اقبال کو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے اختلاف تھا تو اس سے شدید تر اختلاف انہیں کارل مارکس کے نظریہ سے پیدا شدہ نتائج سے بھی تھا اس لئے کہ ان سب کی بنیاد جدلیاتی مادیت اور عمل رد عمل کے فلسفہ پر ہے اور ظاہر ہے کہ بلاواسطہ موثر خدا کو تسلیم کرنے کے بعد کسی ایسے نظریہ کا حامی نہیں ہوسکتا جس کی بنیاد خالص مادیت پر ہو۔ اقبال کے نزدیک اشتراکیت کا منشاء یہ ہے کہ وہ انسان کو روٹی تو دیتی ہے لیکن روح کو فنا کردیتی ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں کہتے ہیں ؂

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ ۔۔۔۔۔ لا سلاطیں، لا کلیسا، لا إلٰہ

اقبال نے اگر ۱۹۱۷ع کے روسی اشتراکی انقلاب سے متاثر ہوکر "ضرب کلیم" کی نظم "اشتراکیت" لکھی تو صرف اس لئے کہ اُنہیں اس انقلاب کے ذریعہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا سحر ٹوٹتا ہوا نظر آیا اور اندریں حالات اُنہیں قرآن کا معاشی نظام، جس کا بیان سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۱۹ میں فرمایا گیا ہے، اب نافذالعمل ہونا ممکن ہوگیا ہے۔ چنانچہ اسی نظم میں مسلمانوں کو اقبال صلاح دیتے ہیں ؂

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرفِ «قل العفو» میں پوشیدہ ہے ابتک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبال کو اس مشینی اور اسکی پروردہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے مغرب میں اُجالا نظر نہیں آیا کیونکہ اُن میں روحانیت اور تقویٰ بالکل مفقود ہے اندریں حالات یہ گناہوں کی بستی ہے، جہاں اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ «ضرب کلیم» کی نظم «شعاعِ اُمید» اور «یورپ اور یہود» کے درج ذیل اشعار میں علی الترتیب کہتے ہیں ؎

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اقبال نے مغرب کے لادین مشینی اور سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت «بالِ جبریل» کی نظم «زمانہ» کے درج ذیل اشعار میں بھی کی ہے جن میں اس نظام کو «جوئے خوں» سے تعبیر کیا ہے ؎

شفق نہیں مغربی افق پر، یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ
ہوائیں اُن کی، فضائیں اُن کی، سمندر اُن کے، جہاز اُن کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

(۴) دانشِ حاضر۔

اقبال نے حکمت مغرب کو ہمیشہ لادینیت اور انکارِ خدا پر مبنی قرار دیا، یہاں تک کہ وہ اسے «بالِ جبریل» کی غزل ۳۹ کے درج ذیل شعر میں «سحرِ قدیم» سے

تعبیر کرتے ہوئے اس کا مقابلہ "چوب کلیم" سے کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یعنی وہی جذبۂ ایمانی جس نے فرعون کے جادوگروں کو زیر کیا تھا جس کی علامت حضرت موسیٰ کی لاٹھی تھی کہتے ہیں ــــہ

ساحرہ پھر دانش حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

اقبال مغرب کی "دانش حاضر" کو صرف "سحر قدیم" ہی کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اسے "عذاب" تک قرار دیتے ہیں "بال جبریل" کی غزل ۴۲ کے درج ذیل شعر میں اس کی مماثلت اُس آگ سے دیتے ہیں جس میں حضرت ابراہیم کو نمرود نے ڈالا تھا ــــہ

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

(۵) مغرب کا نظریۂ قومیت و وطنیت

اقبال مغرب کے نظریۂ قومیت و وطنیت کو بھی سم قاتل سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد اُن کے فلسفہ میں جغرافیائی حدود و ثغور اور حسب نسب پر ہے جو دین اسلام کی نفی کرتی ہے "ضرب کلیم" کی نظم "اشاعت اسلام فرنگستان میں" میں کہتے ہیں ــــہ

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

اقبال "بانگ درا" کی نظم "وطنیت" میں مغرب کے نظریۂ قومیت اور وطنیت کو "تازہ خداؤں" سے موسوم کرتے ہوئے درج ذیل شعر میں اسے "مذہب کا کفن" قرار دیتے ہیں ــــہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور پھر آگے کہتے ہیں ــــہ

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

اقبال اس معاملہ میں (بانگ درا) کی نظم (خضر راہ) کی ذیلی نظم (دنیائے اسلام) کے درج ذیل شعر میں سورۃ الانفال ۸ کی آیت ۴۶ کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ؎

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی　　اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگذر

اور پھر اسی مجموعہ کی نظم (طلوع اسلام) کے چوتھے اور ساتویں بند کے علی الترتیب درج ذیل اشعار میں مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　　تو اے مرغ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وطنیت اور قومیت پر اقبال کے یہ نظریات نتیجہ ہیں ۱۳-۱۹۱۱ ع کی بلقان کی جنگوں اور ۱۸ - ۱۹۱۴ ع کی پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ ترکیہ کے عرب صوبوں کا مغربی سامراجیوں کے ورغلانے پر حسب نسب اور جغرافیائی حدود و ثغور کی بنیادوں پر بغاوت کرکے الگ الگ ملک بنا لینے کا حالانکہ جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ان سامراجیوں نے ان سارے عرب ملک پر یا تو خود قبضہ کرلیا یا وہاں کٹھ پتلی حکومتیں قائم کردیں جو غلامی کی صورت میں قریب ۱۹۶۰ ع تک ان عربوں پر مسلط رہیں۔ اقبال نے عربوں کی اس (بو لہبی) کی وطنیت اور قومیت کے اسلامی نظریوں کے تحت (ضرب کلیم) کی نظم (اُمرائے عرب سے) میں یہ کہہ کر مذمت کی ہے ؎

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأت گفتار　　اگر نہ ہو اُمرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمت کو　　وصالِ مصطفوی، افتراق بولہبی

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا　　محمد عربی سے ہے عالم عربی

(٦) مغرب کا سیاسی نظام۔

اقبال مغرب کے سیاسی نظام کو کمزور قوموں کے استحصال کا ایک آلۂ کار قرار دیتے تھے اس نظام کو (ابلیسی نظام) کا نام دیتے ہوئے (ارمغان حجاز) کی نظم (ابلیس کی مجلس شوریٰ) میں ابلیس کے ایک مشیر کی زبان پر اقبال

یہ شعر رکھتے ہیں ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے ابلیسی نظام پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

اقبال کے نزدیک مغرب کا سیاسی نظام بھی لادینی اور الحاد پر مبنی ہے۔ اُن کا یہ نظام اللہ کے قانون سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے مرجع و منبع شیطانی تعلیمات ہیں۔ اس لئے جو اس نظام کو اختیار کرتے ہیں وہ نیکی اور پاکیزگی سے عاری ہوکر حیوان بن جاتے ہیں اور اُن کا ضمیر مردہ ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نظام مذہب سے سیاست کو الگ کرکے ایسی چنگیزی لادیتا ہے کہ اس کی مثال اُس دیو کی سی ہوجاتی ہے جو ہر قسم کے اخلاقی قیود سے آزاد ہوکر ہر وقت انسانوں کو تباہ کرنے پر آمادہ رہے۔ اقبال نے ان ہی ساری باتوں کو (ضربِ کلیم) کی نظم (لادین سیاست) کے درج ذیل اشعار میں ذہن نشین کرایا ہے ؎

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

اہل مغرب کے اس سیاسی نظام پر (ضرب کلیم) کی نظم (سیاست افرنگ) میں ان فرنگی سیاست دانوں کو شیطان کے مرید اور اللہ کے منکر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(۷) مغرب میں خودی کی موت:

اقبال کا فلسفۂ خودی مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں عرفان ذات اور معرفت الٰہی کے مدارج سے آگاہ کرتے ہوئے (فرشتہ صید اور پیغمبر شکار) کا ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں نیابت الٰہی کے مقام پر سرفراز ہوکر اس زمین میں ظل الٰہی کے اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز ہوسکیں مگر جب اقبال مغرب کی باتیں کرتے ہیں تو ان مغربیوں میں خودی کی موت کی وجہ سے اُن

کا اندرون ہے اور پاتے ہیں جس سے اُن کی مراد روحانیت کا فقدان ہے۔ چنانچہ «ضرب کلیم» کی نظم «مرگ خودی» میں کہتے ہیں ؎

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

اقبال کے فلسفہ میں خودی اُس وقت مرتبہ کمال کو پہنچتی ہے جب وہ عشق سے مملو ہو۔ کیونکہ اُن کے فلسفہ میں خودی عشق کے بغیر ایک اندھی قوت ہے۔ عشق ہی کے فیض سے انسان کے اندر سوز و گداز کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کے نزدیک قدروں اور نصب العین کی تخلیق عشق ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اقبال کے فلسفہ میں عشق ایک بنیادی جذبۂ حیات ہے۔ اقبال مغربی اقوام کے افکار و خیالات میں قوت عشق کو بھی مردہ پاتے ہیں کیونکہ ان کے افکار و خیالات لادینیت و مادہ پرستی پر مبنی ہیں، «ضرب کلیم» کی نظم «عصر حاضر» میں کہتے ہیں ؎

مردہ لا دینی افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

(۸) مغرب اور فنون لطیفہ۔

اقبال فنون لطیفہ کے معاملہ میں تصویر ہو یا ادب، سرود و نغمہ ہو یا رقص نظریۂ مغرب کی تضحیک اس لئے کرتے ہیں کہ ان سے روحانی اقدار، اخلاق حسنہ اور قوت عمل افسردہ ہی نہیں بلکہ مردہ ہوجاتے ہیں اور نتیجتاً انسان کشمکش حیات سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ چند ایسے اشعار درج ذیل ہیں جو سبھی «ضرب کلیم» کے ہیں ؎

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے اس دور کے بہزاد کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
(«مصور»)

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب
(«سرودِ حرام»)

(۹) مغرب کا نظام تعلیم:

اقبال، جو بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خود مغربی علوم کا سمندر پئے

بیٹھے تھے ۔ اس نظامِ تعلیم کو ‹ ضربِ کلیم › کی نظم ‹ دین و تعلیم › کے درج ذیل شعر میں ‹ سازش › قرار دیتے ہوئے اسے اس طرح مطعون کرتے ہیں ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال اس نظامِ تعلیم کو خودی کی موت کے مترادف بھی قرار دیتے ہیں ۔ اس کے مضر اور مفسد اثرات کو اقبال نے ‹ ضربِ کلیم › کی نظم ‹ نصیحت › کے درج ذیل اشعار میں ایک فرنگی سیاست داں کا اپنے پسر کو دئیے گئے یہ مشورے ذہن نشین کراتے ہیں ؎

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر   کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو   ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب   سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

ایسے تو اقبال کا تصورِ علم اُن کے کلام میں بکھرا پڑا ہے مگر ایک موقع پر انہوں نے خواجہ غلام السیدین کے نام لکھے گئے درج ذیل خط میں اسے ان الفاظ میں منضبط کیا ہے

‹ علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے ۔ عام طور میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے ۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے ۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے ع

‹ بو لہب را حیدرِ کرار کن ›

‹ اگر یہ بو لہب ، حیدرِ کرار بن جائے یا یوں کہئیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسانی کے لئے سراسر رحمت ہے ۔ ›

اس خط کو ‹ ضربِ کلیم › کی نظم ‹ علم و دین › کے ان اشعار کے ساتھ پڑھا جائے

تو اقبال کے تصورات علم اور بھی واضح ہوجاتے ہیں ؂

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں — تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اقبال کے نزدیک علم حاضر بذات خود مضر نہیں۔ مسلمان اگر مغربی تعلیم حاصل کرکے دین سے بیگانہ ہوجاتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کا زاویۂ نگاہ غلط ہے اگر وہ علوم و فنون جدید کو اس غرض سے حاصل کریں کہ ان کو دین کا خادم بنائیں اور اُنہیں پڑھ کر دین و ملت کی خدمت کریں تو یہی علوم اُن کے حق میں مفید بھی یار غمگسار بن جائے گا۔ اس نکتہ کو اقبال نے (بال جبریل) کی نظم (پیر و مرشد) میں اپنے پیر مولانا روم سے مکالمہ کے طور پر اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔ مرید یعنی اقبال پیر سے دریافت کرتے ہیں ؂

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں — علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

تو پیر یہ جواب دیتے ہیں ؂

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

یعنی تلوار بذاتہ خود اچھی ہے نہ بری۔ اس کا مقصد حصول یا استعمال اسے محمود یا مذموم بنا دیتا ہے مثلاً اگر ایک شخص کسی مظلوم کی حمایت میں تلوار اُٹھائے تو وہ بہت اچھی ہے لیکن اگر کسی بے گناہ کا خون کردے تو وہی تلوار بہت بری ہے

یہ نہیں کہ اقبال مغربی تعلیم یا مغربی علوم حاصل کرنے کے خلاف تھے مگر ان کے حصول کے ساتھ ان کی کچھ شرائط تھیں مغربی علوم کا حاصل کرنا اُن کے نزدیک گناہ نہیں اُن کے نزدیک مسلمانوں کی منزل کفار فرنگ کی طرح صرف مادی ترقی نہیں ہے بلکہ خلیفۃ الارض کے منصب جلیلہ پر فائز ہونا ہے۔ اس لئے قدم اُٹھا اور تسخیر کائنات کے بعد اس روحانی مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر (ضرب کلیم) کی نظم (محراب گل افغان کے افکار) کے اُنیسویں بند میں کہتے ہیں ؂

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن — قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس کے بعد ہی مغربی علوم حاصل کرنے کے متعلق اپنی پوزیشن اس طرح واضح کرتے ہیں ؎

کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں

یعنی ان مغربی علوم کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شرط بدن میں "سوز لا الٰہ" کا بھی ہونا ضروری ہے یہی صلاح وہ اپنے لڑکے جاوید اقبال کو جو لندن میں زیر تعلیم تھے، "ضرب کلیم" کی نظم "جاوید سے" کے پہلے بند کے ان اشعار میں دیتے ہیں ؎

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخ گل پر چہک و لیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ

الغرض اقبال کے نظریۂ مغرب پر اس مختصر سی گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال کے اس ماورائی مسلک اسلامیت میں مشرق کی عارفانہ فکر اور جدید مغرب کی فلسفیانہ فکر کا ایک خوشگوار امتزاج ہے مشرق کی عارفانہ فکر کی رو سے کائنات تجلیوں کا ایک نظام ہے اور انسان تجلی کی انتہائی منزل۔ اقبال کے روحانی مزاج نے اسی راستہ کے امکانات کی تلاش کی ہے اور اس نقطۂ نظر کو یورپی ارتقائی میلان سے ہم آہنگ کرنے کی ایک معنی خیز کوشش کی ہے۔ اگر اقبال "ضرب کلیم" کی غزل (بعد از نظم "اہل ہنر سے") میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ ؎

اہل نظر ہیں یورپ سے نومید ان اُمتوں کے باطن نہیں پاک

تو مسلمانوں کو اسی مجموعہ کی نظم "شعاع اُمید" کے تیسرے بند کے درج ذیل شعر میں اقبال مشرق کی روحانیت کے ابدی اقدار اور مغرب میں وقوع پذیر ہونے والے تاریخی تبدیلیوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے مشرق اور مغرب دونوں کو اسلام کا زندگی بخش پیغام پہنچانے کی تلقین کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

• •

کلکتہ میں علوم شرقیہ کے ادارے

(۱۹ ویں صدی تک)

ار

رئیس انور، اسٹائلو بلڈنگ، مٹھوا خاں لین، دربھنگا-۸۴۶۰۰۴

اٹھارویں صدی کے وسط میں نواب سراج الدولہ کی شکست اور شہادت کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سیاست آمیز تجارتی سرگرمیوں کا دائرہ تیزی سے پھیلانا شروع کیا۔ مرشدآباد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی افق پر اس شکست کی گھٹائیں چھانے لگیں تو کلکتہ کو ایک مرکزی حیثیت دے کر اُسے مختلف سطحوں پر سارے ہندوستان سے جوڑنے کی سعی کی گئی۔ مقبول اور مروج زبانوں سے دلچسپی، ماضی کے شاہکار کی بازیافت، کثیر الجہت درسگاہوں اور کتب خانوں کا قیام اور ولایتی افسروں کے لیے ہندوستانی سیکھنے کی لازمی شرط اسی کی کڑیاں ہیں۔ ۱۹ویں صدی کے وسط تک اس پس منظر میں مدرسۂ عالیہ (۱۷۸۰ع) ایشیاٹک سوسائٹی (۱۷۸۴ع) اورینٹل سیمینری (۱۷۹۹ع) فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ع) پبلک لائبریری (۱۸۳۶ع) اور کلکتہ یونیورسٹی (۱۸۵۶ع) جیسے ہم‌ند سار ادارے وجود میں آئے، جن میں بہطور پر علوم و السنہ شرقیہ و عربیہ کی تدریس، تحفظ اور توسیع و اشاعت کی گئی۔ پبلک لائبریری اور کلکتہ یونیورسٹی بنیادی طور پر علوم شرقیہ کے لیے قایم نہیں ہوئی تھی لیکن دوسرے اداروں کا بنیادی مقصد مشرقی علوم کی تدریس اور تحفظ تھا۔ یہی سبب ہے کہ علمی، ادبی اور لسانی سرگرمیوں کا ایک نیا مرکز کلکتہ بنا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی کارگـــزاریوں کا مطالعہ کیا جائے تو بدیسی حکمرانوں کے طریقۂ کار، منصوبہ بندی اور پیش بندی کی ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس لیے مذکورہ اداروں کے سال تاسیس کے لحاظ سے تفصیل فراہم کی گئی ہے:

مدرسۂ عالیہ: عربی و فارسی کے ایک اہم عالم مولانا مجدالدین کی ذات سے مدرسہ عالیہ کا گہرا تعلق ہے۔ موصوف شاہ ولی اللہ دہلوی کے خلیفہ تھے اور

۱۷۶۲ ع سے کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کی دینی آگہی اور علمی بصیرت سے متاثر ہوکر شہر کے عمائد و اکابر نے وارن ہیسٹنگز سے ۱۷۸۰ ع میں درخواست کی کہ انہیں مستقل طور پر کلکتہ میں رہنے پر راضی کیا جائے اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک سرکاری مدرسہ قائم کیا جائے۔ وارن ہیسٹنگز نے اسے فوراً منظور کرلیا اور علامہ مجدالدین کے نزدیک بیٹھک خانہ میں اپنے خصوصی فنڈ سے کرائے کے ایک مکان کا بندوبست کیا جہاں شعبان ۱۱۹۴ ھ اگست ۱۷۸۰ ع میں برصغیر کی مثالی درسگاہ بنام مدرسۂ عالیہ قائم ہوئی۔ ایک ہی سال میں اس کی شہرت و مقبولیت ایسی ہوئی کہ دور دراز سے تحصیل علم کے لیے آنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ جس کی وجہ سے مذکورہ مکان غیر اطمینان بخش ہوگیا۔ وارن ہیسٹنگز نے دوبارہ اپنے اخراجات سے پدو پوکھر (موجودہ بو بازار) میں ایک قطعۂ آراضی مع مکان حاصل کیا اور ۱۷۸۱ ع میں مدرسہ نئے احاطہ میں منتقل ہوگیا

سررشتۂ علوم شرقیہ میں عربی، فارسی اور اردو زبانوں اور ان سے منسلک علوم کو شامل کیا گیا ہے

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے وارن ہیسٹنگز کے اس اقدام کو پسند کیا اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے ضلع چوبیس پرگنہ کے چند گاؤں مدرس اول کی نگرانی میں دینے کی اجازت بھی دی۔ علاوہ ازیں بنگال کے نائب نظام کو ہدایت کی گئی کہ مستقبل میں جرائم کی عدالت میں مدرسہ عالیہ کے سند یافتہ لوگوں کو ملازمت دی جائے

۱۸۲۳ ع میں پدو پوکھر والا مکان بوجوہ نامناسب معلوم ہوا تو مدرسہ کے سیکریٹری مسٹر لمسڈن اور نائب سیکریٹری مولوی حافظ احمد کی کوششوں سے کالنگا (موجودہ حاجی محمد محسن اسکوائر) میں نسبتاً زیادہ کشادہ زمین خریدی گئی اور مکانات وغیرہ کی تعمیر کے بعد اگست ۱۸۲۷ ع سے وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، جو اب تک جاری ہے

مولانا مجدالدین اسکے پہلے نگراں اور مدرس اول مقرر ہوئے تھے

۱۷۹۱ ع میں ان کی سبکدوشی کے بعد ایک اور اہم عالم محمد اسرائیل مدرس اول بنائے گئے یہ روایت انیسویں صدی کی ابتدا تک رہی لیکن اس کے بعد مدرسہ پر حکمرانوں کی خاص توجہ ہوئی اور مدرس اول یا صدر مدرس (جسے بعد میں پرنسپل کہا جانے لگا) کی جگہ پر مستشرقوں کو بحال کیا جانے لگا ۱۸۵۱ ع میں مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر اور ۱۸۵۷ ع دوسرے نامور مستشرق ناسویس اس عہدے پر فائز ہوئے تھے بعد میں دیگر عہدوں پر بھی ولایتی اساتذہ بحال ہونے لگے۔

۱۷۸۱ ع میں مدرس اول کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی اس میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا تھا مدرسوں کو درس و تدریس کے علاوہ تحقیقی کام کرنے کی سہولت فراہم کی گئی تھی جس کی بنا پر اساتذہ نے علوم شرقیہ پر تحقیقی مضامین لکھے اور عربی و فارسی کے بعض قلمی نسخوں کو مرتب کیا جو عموماً ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے مجلہ میں شائع ہوئے۔

مدرسہ میں عربی، فارسی، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کی تعلیم کا باقاعدہ نظم تھا۔ بعد میں طب کا بھی ایک شعبہ قائم کیا گیا اور عرصہ تک اس کے لیے علاحدہ سرکاری گرانٹ ملتی رہی کلکتہ میڈیکل کالج کے قیام کے ساتھ ولیم بینٹنگ نے ۲۸ جنوری ۱۸۳۵ ع سے شعبۂ طب کی گرانٹ بند کردی۔

نصاب کی دو کتابوں کا پتا چلتا ہے پہلی (مجموعۂ نقول فارسی) مرتبہ لیفٹننٹ گالوے ہے جو دراصل ڈیڑھ سو فارسی حکایتوں کا انتخاب ہے اور ٹائپ میں کلکتہ سے ۱۸۱۲ ع میں چھپا ہے، اس پر درج ہے (برائے امتحان متعلمین صاحبان مدرسۂ عالیہ)۔ دوسری کتاب ولیم لالر کی ترتیب دی ہوئی (تحریر اقلیدس) ہے ولیم لالر مدرسۂ عالیہ کے مدرس بھی تھے۔

۱۸۲۹ ع سے اس مدرسے میں انگریزی بھی داخل کی گئی بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس کا خیرمقدم کیا بنگال کے معروف تذکرہ نگار اور شاعر عبدالغفور نساخ کے بڑے بھائی عبداللطیف اس مدرسے سے انگریزی کے سند یافتہ پہلے مسلمان تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ماحول بنا جس کی پیش بندی وارن ہیسٹنگز نے

کی تھی۔ ۱۸۱۳ ع میں جب وہ دوبارہ بنگال کا گورنر بنا تو اس نے مقامی حالات محاسبہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

«مغربی تعلیم کی افادیت میں دو رائیں نہیں لیکن جس نظام تعلیم نے ایک زمانے تک مفید ہونے کا ثبوت دیا ہے اور مسلمانوں کا پسندیدہ ہے، اسے راتوں رات ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ہمیں مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی افادیت سے متاثر کرنا چاہئے اور جب وہ اسے اپنانا چاہیں گے تو اس کے لاگو کرنے کا صحیح وقت وہی ہوگا۔» (۱)

مدرسے کے فارغ لوگوں کے ملازم ہونے سے مسلمانوں کی معاشی حالات پر مثبت اثر پڑا اور بیرون کلکتہ کے لوگ بھی اس مخلوط تعلیم کی طرف راغب ہوئے جس سے حکمرانوں کو یقین ہوگیا کہ اس طرح کے نظام تعلیم سے مسلمانوں کا دل جیتا جاسکتا ہے۔ بنگال کے گورنر کا درج ذیل حکم اسی پر دال ہے۔

«... بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سر جی کیمپ بیل نے حکم صادر کیا کہ صوبے کے مشرقی اضلاع (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) کے اسکولوں میں عربی و فارسی کے استاد مقرر کیے جائیں۔ ...یہ طے پایا کہ کلکتہ کے مدرسے کے نمونے پر بنگلی ڈھاکا رنگپور اور چاٹ گام میں نئے مدرسے قائم کیے جائیں گے۔ ان اداروں میں فارسی، عربی و فقہ کی تعلیم دی جائیگی۔» (۲)

ان مدرسوں میں جلد ہی مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کا نیا نصاب لاگو کردیا گیا، جس سے مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی ہونے لگی — ان حقائق کی روشنی میں مدرسۂ عالیہ کو ہندوستان میں مشرقی علوم و السنہ کا پہلا ماڈل ادارہ قرار دیا جاسکتا ہے

ایشیاٹک سوسائٹی اٹھارویں صدی کے نصف اول تک بنگال میں ایک ہی کتب خانہ تھا جسے نواب سراج الدولہ نے مرشد آباد میں قائم کیا تھا۔ ربع آخر میں کلکتہ کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے حکمرانوں نے کتب خانہ کی کمی محسوس کی اسی دوران اکتوبر ۱۷۸۳ ع میں ہندوستانی علوم و فنون سے گہرا شغف رکھنے والے

ولیم جونس (۱۷۴۶ع - ۱۷۹۴ع) فــورٹ ولیم کے سپریم کورٹ میں چھوٹے جج (Puisne Judge) بن کر کلکتہ آئے۔ آتے ہی انہوں نے نہ صرف سنسکرت زبان سیکھنا شروع کی بلکہ ایک کتب خانــہ کے قیام کے سلسلے میں اکابر شہر سے تبادلۂ خیال بھی کیا ماحول سازگار ہوا تو جمعرات ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ع کو رابرٹ چیمبرس کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں کلکتہ کی یوروپی برادری کے اکابر موجود تھے۔ ولیم جونس نے کتابوں اور دیگر نادرات کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ایک ادارے کے قیام سے ایشیا کی قدرتی اور تہذیبی تاریخ، متقدمین کے علم و ہنر، فن، سائنس اور ادب کی جانکاری اور تحقیق ممکن ہوسکے گی۔ تجرباتی شعور پیدا ہوگا اور ایشیا کا جغرافیائی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر سامنے آئے گا قومی روایت، مذہبی اور لسانی رجحانات کا اندازہ ہوگا ریاضی، اقلیدس، پیمائش، میکانک نجوم، طبعیات، اخلاقیات قواعد، علم بیان، بولیوں، جراحی، طب، کیمیا، زراعت، تجارت، موسیقی، فن تعمیر، مصوری، شاعری اور تمثیلی ادب کا علم ہوگا ساتھ ہی ساتھ شعور و فکر کی توسیع ہوگی۔

ولیم جونس کی خیال انگیز اور مؤثر تقریر سے یوروپی برادری کا مثبت رد عمل سامنے آیا اسی جلسے میں Asiatic Society نام کے ایک تحفظی ادارے کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی اعلیٰ افسروں نے اس میں بڑی مہارت کی جس سے ابتدائی کام میں سہولت ہوئی ۵ فروری ۱۷۸۴ع کو دوسرے جلسے میں ولیم جونس ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر نامزد ہوئے اور ۲۷ اپریل ۱۷۹۴ع تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر گورنر جنرل جان شورے نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ ولیم جونس کے زمانے میں سوسائٹی کی کارروائیاں فورٹ ولیم کے سپریم کورٹ کے گرانڈ جیوری روم میں ہوا کرتی تھیں لیکن ان کے انتقال کے بعد کتابوں، کاغذات اور نادرات کے انبار کو دیکھتے ہوئے کمپنی سے کشادہ مکان فراہم کرنے کی درخواست کی گئی مارچ ۱۸۰۲ع میں پارک اسٹریٹ موڑ پر زمین کا ایک ٹکڑا سوسائٹی کے حوالے کیا گیا جہاں ۱۸۰۵ع سے تعمیری کام شروع ہوا اور ۱۸۰۸ع کے اوائل میں سوسائٹی نئے مکان میں منتقل ہوگئی۔

تقریباً پچاس سال تک سوسائٹی کا نام برقرار رہا۔ اس کے بعد لندن کی The Asiatic Society of Great Britain and Ireland کے اثر سے اس کے نام میں ترمیم کرکے اسے The Asiatic Society of Bengal کردیا گیا۔ اس کی حیثیت ایک نیم آزاد ادارے کی تھی۔ کمپنی کی حکومت کی طرف سے اسے گرانٹ اور دیگر سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں نظم و نسق کے لیے ایک کونسل اور ایک مجلس عاملہ تھی۔ ان دونوں سطحوں پر ولایتی افراد عموماً نامزد ہوتے تھے ۱۹ویں صدی میں دو ایک بنگالی دانشور بھی رکن بنائے گئے ۱۸٦۰ ع میں نواب عبد اللطیف کو مجلس عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا چند سال بعد وہ کونسلر بھی بنائے گئے۔ سوسائٹی کے پہلے سو سال کے دوران وہ پہلے مسلمان کونسلر ممبر تھے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کے ابتدائی دور میں ممبروں کی تحفتہً دی ہوئی کتابیں ہی تھیں۔ ذخیرۂ کتب میں پہلی بار سرنگا پٹم (دار السلطنت میسور) پرانگریزی کمپنی کی طرف سے فروری ۱۸۰۸ ع میں اضافہ کیا گیا کمپنی نے ٹیپو سلطان کے محل سے حاصل کی ہوئی کتابیں اور صحیفے سوسائٹی کو تحفے کے طور بھیج دیئے۔ اس میں قرآن اور پنج سورہ کے منقش نسخے، سعدی کے اصل مسودۂ گلستاں کی پہلی نقل اور پادشاہنامہ کا ایک ایسا مسودہ (Codex) بھی تھا جس پر شاہجہاں کے دستخط تھے، تحفہ جات کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا فورٹ ولیم کالج، جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشنز وغیرہ سے بھی مختلف النوع کتابیں بھیجی جاتی تھیں۔ ۱۸۳۵ ع تک کتابوں کی کل تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی فورٹ ولیم کالج کے پہلی بار بند کیے جانے پر عربی، فارسی، اردو اور سنسکرت کا کچھ اثاثہ مشروط طور پر سوسائٹی نے خاصے سرمائے سے حاصل کیا۔ اس اثاثہ میں خطی نسخوں کی تعداد زیادہ تھی۔

مولوی ظہور علی نے ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود مطبوعہ وغیرمطبوعہ کتابوں کی ایک فہرست ترتیب دی تھی، جس کی اشاعت جیمس پرنسپ کی نگرانی میں نومبر ۱۸۳۷ ع میں مطبع گلدستہ نشاط، کلکتہ سے ہوئی ہندوستان میں علوم شرقیہ کی یہ پہلی فہرست ہے جو فارسی زبان میں ہے اس کا پورا نام ہے۔ "فہرست کت

قلمی و مطبوعہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی — مع کتب کالج فورٹ ولیم یعنی مدرسۂ انگریزی شہر کلکتہ کہ نقل و تحویل دریں کتب خانہ رسیدہ)، اس میں عربی و فارسی، اردو، ترکی، پشتو اور پنجابی کتابوں اور خطی نسخوں کا اندراج ہے۔ عربی کی نو سو پینتیس (۹۳۵) کتابیں/خطی نسخے، قرآن مجید کے اسی (۸۰) نسخے، پنج سورہ کے تینتیس نسخے اور فارسی کی ایک ہزار تین سو اکانوے (۱۳۹۱) اور اردو کی ایک سو چھ (۱۰۶) کتابوں کے خطی نسخوں کا اندراج حروف تہجی کے مطابق کیا گیا ہے

۱۹ ویں صدی کے مشہور بنگالی عالم، ایشیاٹک سوسائٹی کے پہلے بنگالی سیکریٹری اور لائبریرین ڈاکٹر راجندر لال مترکی فراہم کردہ تفصیل سے گمان ہوتا ہے کہ ۱۸۳۷ ع ہی میں کوئی اور کیٹلاگ بھی تیار ہوا تھا جس میں دو ہزار سات سو بیالیس کتابوں اور خطی نسخوں کے نام درج تھے عربی میں ایک ہزار تیرہ، فارسی میں ایک ہزار چار سو اٹھارہ اور اردو میں تین سو گیارہ کتابیں اور خطی نسخے تھے۔ (۳)

۱۸۳۸ ع میں سنسکرت، مگدھی، بنگالی، ہندی، کرنالکی، تلنگی اور مراٹھی کتابوں اور خطی نسخوں کا کیٹلاگ بنایا گیا، جس میں کل اٹھارہ سو اندراجات تھے۔ سوسائٹی کے ذخیرے میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا انگریزی، چینی، تبتی، برمی اور سامی کتابیں اور خطی نسخے (بعض Palm کے پتوں پر لکھے ہوئے) بھی جمع ہو گئے۔ پھر بعض نقش (Inscription)، سکے، تصویریں، نصف مجسمے (Busts) اور بت (Sculpture) اکٹھا کر کے ایک میوزیم بنایا گیا جو سوسائٹی کی عمارت ہی کے ایک حصے میں تھا۔

حقائق و شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے درمیانی دور میں ارباب حل و عقد نے سوسائٹی کے سنسکرت کے ذخیرے پر خاص توجہ دی۔ جس کی وجہ سے ۱۸۸۰ ع تک سنسکرت کی تین ہزار تین سو اٹھہتر (۳۳۷۸) کتابیں اور دو ہزار پانچ سو سات (۲۵۰۷) خطی نسخے اکٹھا ہو گئے جب کہ مذکورہ سال تک عربی میں ایک ہزار ایک سو اکسٹھ، فارسی میں ایک ہزار پانچ سو چھ

اور اردو میں تین سو کتابیں اور خطی نسخے تھے۔ اگر ۱۸۳۷ ع والی فہرست سے ان اعداد و شمار کا مقابل کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے ذخیرے میں کم و بیش سو سو کتابوں، خطی نسخوں کا اضافہ ہوا جب کہ اردو کے ذخیرے میں کمی آئی اور گیارہ کتابیں اور/یا خطی نسخے ضائع ہوگئے

علوم شرقیہ کی اس پہلی تحفظ گاہ سے ایک جرنل بھی شائع ہوا ۱۷۸۷ ع کے وسط میں ولیم جونس کی نگرانی میں Asiatic Miscellany کا پہلا شمارہ نکلا جو مختلف زبانوں اور علوم سے متعلق مضامین پر مشتمل تھا۔ کئی مراحل سے گذرنے کے بعد مارچ ۱۸۳۲ ع میں اس کا نام بدل کر The Journal of the Asiatic Society of Bengal رکھا گیا اس میں عموماً مشرقی زبانوں اور علوم و فنون پر تعارفی اور تحقیقی مضامین یا مرتب کی ہوئی مختصر کتابیں شائع ہوتی تھیں مصنفوں میں مستشرقین کے علاوہ کلکتہ کے علماء و اساتذہ شامل تھے۔ علوم شرقیہ کے لئے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کی جاتی تھیں، جرنل کے Bibliothic Series میں ان کے کام کی اشاعت ہوتی تھی

اس ادارے سے عربی فارسی خطی نسخے ایڈیٹ کرکے شائع کئے گئے۔ ان میں قانون ہمایونی، آئین اکبری، اکبر نامہ، طبقات اکبری، تزک جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری، تاریخ فیروز شاہی، شاہ عالم نامہ، بادشاہ نامہ، احوال مہابت، مآثر الامراء، مآثر رحیمی، ریاض السلاطین، فتوح الشام، تاریخ بیہقی، منتخب التواریخ، ہفت اقلیم، طبقات ناصری، کتاب الاصابہ فی تمیز الصحابہ، منتخب اللباب، کشاف اصطلاحات الفنون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اوریئنٹل سیمینری: تسخیر بنگالہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عزائم میں رابطے کی زبان اردو اور دفتر کی زبان فارسی ایک رکاوٹ تھی تو اہل اقتدار نے بہتر سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۷۹۷ ع میں ویلزلی کے گورنر جنرل بن کر آنے کے بعد اس حکمت عملی کو اور سختی سے اپنایا گیا، ۲۱ دسمبر ۱۷۹۷ ع کو گورنر نے ولایتی ملازموں کو اردو فارسی سیکھنے کا حکم دیا اور ملازموں کو ان

زبانوں کی طرف راغب کرنے کے لیے ماہانہ تیس روپیے فی کس کا خصوصی بھتا دینا بھی منظور کیا۔ لیکن ان ایام میں کوئی ایسی مقامی درسگاہ نہیں تھی جہاں انگریزی کے ذریعے ہر دو زبانیں سکھائی جاتیں۔ مقامی اساتذہ اس کے اہل نہیں تھے اس دوران میں نامور مستشرق جان بارتھوک گل کرسٹ کلکتہ میں مقیم تھے اور ہندوستانی کی قواعد اور لغت ترتیب دے چکے تھے۔ انہوں نے ویلزلی کو مشورہ دیا کہ پہلے دیسی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ مقامی اساتذہ سے رابطہ قائم کرنے میں دشواری نہ ہو انہوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ وہ خود سول ملازموں کو دیسی اور فارسی زبان کی تعلیم دینے کے لئے تیار ہیں۔ ویلزلی نے اس رائے کی معقولیت کے پیش نظر کمپنی کی کونسل میں ایک قرارداد منظور کرالی:

"مسٹر گل کرسٹ کی پیش کش کو قبول کرلینا ہی مناسب ہوگا کیوں کہ دیسی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے میں یہ تجویز ممد ثابت ہوگی۔ میری رائے ہے کہ اس کو منظور کرلیا جائے اور آئندہ جنوری سے اس پر عمل در آمد ہوجائے۔ کلکتے میں جو نو وارد رائٹر (۴) اس وقت موجود ہیں، ان کو ایک سال تک گل کرسٹ سے درس لینے کی ہدایت کی جائے۔ اس معینہ مدت کے بعد ان کا امتحان لیا جائے گا، جس کے اصول بعد میں متعین کئے جائیں گے تاکہ مجوزہ طریق تعلیم کی موزونیت کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے"۔ (۵)

اس کے مطابق کمپنی نے گل کرسٹ کو ۲۵ دسمبر ۱۸۹۸ع سے بحیثیت استاد بحال کیا اور درس و تدریس کے لیے یکم جنوری ۱۸۹۹ع سے رائٹرس بلڈنگ میں ایک کمرہ مخصوص کردیا گیا اسی محدود تدریسی ادارے کو اورینٹل سیمینری کا نام دیا گیا۔

کمپنی کی طرف سے گل کرسٹ کی کوئی باضابطہ تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ درس لینے والوں کی خصوصی بھتے کی رقم اسے دے دی جاتی تھی۔ ۲۹ جنوری ۱۷۹۹ع تک اکتیس (۳۱) سول ملازم منتخب ہوئے اور دوسرے مہینے سے ان کی تعلیم شروع ہوئی، گل کرسٹ نے نصابی ضرورت کے تحت ایک سہ لسانی کتابچہ تیار کیا تھا جس کا نام تھا ـــ دو ایجاد یعنی نقشۂ افعال فارسی مع مصدرات و مترادف

ہندوستانی و فارسی و انگریزی، غالباً شروع میں خطی نسخوں سے کام چلایا جاتا رہا ہوگا کیوں کہ اس کی طباعت ۱۸۰۱ع میں ہوئی

۹ جنوری ۱۸۰۰ع کو ویلزلی نے زیر تعلیم ملازموں کی لیاقت جانچ کا حکم صادر کیا پھر اس مقصد سے گل کرسٹ کی سیکریٹری شپ میں پانچ افسری کمیٹی بنائی گئی، جس نے ۲۱ جولائی سے طالب علموں کی جانچ کی اور ایک رپورٹ تیار کی۔ اس میں گل کرسٹ اور اس کے مذکورہ کتابچہ کی تعریف بھی کی گئی۔ ویلزلی نے کامیاب طالب علموں میں سے بارہ کو نقد انعام اور تمغے دیئے اور ان کی زبان دانی کو سراہا۔ اس نے بھی گل کرسٹ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

"ہندوستانی زبان کے لغت و قواعد کی جو کتاب مسٹر گل کرسٹ نے تالیف کی ہے اس کے متعلق بھی گورنر جنرل باجلاس کونسل اس موقع پر اپنی خوشنودی کا اظہار مناسب سمجھتے ہیں۔ اس کتاب نے اس زبان کی تحصیل میں بے حد سہولتیں پیدا کر دی ہیں، جو سارے ہندوستان میں بہت زیادہ بولی جاتی ہے کمپنی کے جونیئر سول ملازمین کو، جنہیں مسٹر گل کرسٹ سے ہندوستانی و فارسی سیکھنے کی ہدایت کی گئی تھی، تعلیم دینے کے فرض منصبی کو جس سرگرمی، لیاقت و تندہی سے انہوں نے پورا کیا ہے، وہ بھی گورنر جنرل باجلاس کونسل کے نزدیک قابل ستائش ہے"۔ (۶)

اس محدود ادارے کے کامیاب تدریسی تجربے کے پیش نظر ویلزلی نے بڑے پیمانے پر ایک منصوبہ بنایا اور اسے کم و بیش ڈیڑھ سال کے اندر بند کر دیا گیا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اورینٹل سیمینری ایسٹ انڈیا کمپنی کا قائم کیا ہوا اپنی نوعیت کا پہلا تدریسی ادارہ تھا جس میں یوروپ سے آنے والوں کو مشرقی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ علاوہ بریں اسے فورٹ ولیم کالج کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے

فورٹ ولیم کالج ویلزلی کا سیاسی شعور، دور اندیشی اور حکمت عملی مستحکم تھی۔ اورینٹل سیمینری کے مثبت نتائج سے اس کے حکمرانہ عزائم کو جلا ملی تو اس نے ایک کثیر الجہات ادارے کا جامع منصوبہ بنا کر ۹ جولائی ۱۸۰۰ع

انگلستان کمپنی کونسل کے سامنے پیش کیا اور کونسل کے اراکین کی حمایت حاصل کرنے کے بعد ڈائرکٹروں کو منظوری کے لیے بھیج دیا۔ شاید یہ مرحلہ رسمی تھا اس لئے دوسرے دن یعنی ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ع/۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ کو فورٹ ولیم کالج کی قانونی طور پر بنیاد ڈالی گئی۔ اسی دن کالج کا دستور العمل بنایا گیا جس پر ویلزلی نے اپنے خصوصی اختیارات سے ۱۰ جولائی کے بجائے ۴ مئی ۱۸۰۰ع کی تاریخ ڈلوائی جو دراصل سقوط میسور کی پہلی سالگرہ کی یادگار تھی۔ بعد میں کالج کے کامیاب طلبا کو انعام کے طور پر دینے کے لیے جو تمغے بنوائے گئے، ان کی ایک طرف بھی میسور کی راجدھانی سرنگاپٹم کی تصویر تھی اور دوسری طرف سقوط کی تاریخ کندہ تھی۔ (۷)

ویلزلی، کالج کے لیے کلکتہ کے دکھنی حصے گارڈن ریچ (۸) میں ایک کثیر المقاصد احاطے کا تصور رکھتا تھا، لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ڈلہوزی اسکوائر کے قریب (۹) ایک وسیع عمارت میکڈونلڈ نامی ایک انگریز سے کرائے پر لی گئی۔ (۱۰) جس میں درس و تدریس، مطالعہ اور قیام و طعام کا انتظام کیا گیا۔ انتظامی اور تعلیمی امور کے لیے پانچ رکنی کمیٹی بنائی گئی، جس کے پرووسٹ پادری ریورنڈ ڈیوڈ براؤن تھے۔ علوم شرقیہ کے لیے گل کرسٹ، جان بیلی، ولیم کرک پیٹرک، فرانسس گلیڈون، ایڈ مونسٹن اور لمس ڈن کے علاوہ ملک کے مختلف اہم اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عربی، فارسی اور اردو (ہندوستانی) کے شعبے قائم ہوئے جن کے سربراہ مستشرقین ہوتے تھے اور ان کا عہدہ پروفیسر یا اسسٹنٹ پروفیسر کا تھا۔ انہیں یکساں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کسی پروفیسر کو پندرہ سو روپے ماہانہ ملتے تھے تو کسی کو سولہ سو روپے ماہانہ۔

مقامی اساتذہ میر منشی، نائب منشی، منشی، ماتحت منشی، سندی منشی یا مترجم کہلاتے تھے اور ان کی تنخواہ لیاقت اور کام کے مطابق تیس روپے سے لے کر دو سو روپے ماہانہ تک تھی۔ میر بہادر علی حسینی اردو کے پہلے منشی تھے، میر شیر علی افسوس، تارنی چرن متر، میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، مظہر علی ولا، کاظم علی جوان وغیرہ مختلف سطحوں پر بحال تھے۔ فارسی اور ناگری

خوشنویس اور قصہ خواں کی بھی تقرری ہوتی تھی۔ کالج کے سربراہوں نے کئی اہم ادیبوں مثلاً مرزا علی لطف، بینی نرائن، مرزا جان تپش، نہال چند لاہوری وغیرہ سے تالیف، تلخیص یا ترجمے کا کام کرایا اور نقد انعام سے نوازا۔

۶ فروری ۱۸۰۱ ع سے کالج میں درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ گل کرسٹ نے اردو فارسی کی کئی کتابیں منتخب کیں اور نصابی ضرورت کے پیش نظر چھپوانے کی مانگ کی لیکن اس میں کامیابی نہ مل سکی صرف مسکین کے مرثیے فوری طور پر کونسل کی منظوری سے چھاپے گئے تھے اس لئے کالج کے ابتدائی نصاب میں اسے شامل سمجھنا چاہئے۔

گارساں دتاسی کے ایک خطبے سے بھی نصاب کا پتا چلتا ہے:

«میں اپنے درسوں کے دوران میں کئی سال (ہندوستانی) انتخابات پڑھاتا رہا ہوں یہ عمدہ انتخاب واصل شیکسپیر کا کیا ہوا ہے اور اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کالجوں کے نصاب میں داخل تھا۔ اب اس کی جگہ، طوطا کہانی، اور «باغ و بہار» رکھی گئی ہیں» (۱۱)

کالج کی روداد اور دیگر دستاویزوں سے نصاب کی واضح نشاندہی نہیں ہوسکی ہے لیکن ضمنی ماخذوں سے گمان غالب ہے کہ گل کرسٹ کے ذریعہ کلکتہ کے مختلف پریس سے چھپنے والی درج ذیل کتابیں نصاب میں شامل رہی ہوں گی:

اخلاق ہندی، بیتال پچیسی، توتا کہانی، چار درویش، حکایات متفرقات، سنگھاسن بتیسی، شکنتلا ناٹک، گلستاں، مادھونل مثنوی میر حسن، مرثیۂ مسکین اور ہفت گلشن — اس طرح کے غیر مصدقہ شواہد اور قیاسات کی مزید جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب کا حتمی علم ہوسکے۔

کالج میں جو کتب خانہ تھا اس میں ابتداً عطیہ کے طور پر حاصل کی ہوئی مغربی زبانوں کی مطبوعہ کتابیں اور مشرقی زبانوں کے خطی نسخے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کے کئی نادر خطی نسخے اس میں منتقل کئے گئے۔

جس سے ذخیرۂ کتب میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ طلبا اور اساتذہ اس سے یکساں طور پر استفادہ کرتے تھے۔ اس کی کسی قدر تفصیل سبط حسن نے فراہم کی ہے:

"۔۔۔۔ابتدا میں طلبہ کو کتابیں گھر لے جانے کی اجازت تھی مگر جب طلبہ کی لاپروائی سے نایاب مخطوطات گم ہونے لگے تو اگست ۱۸۰۷ع میں کتابیں لائبریری کے باہر لے جانے کی ممانعت ہوگئی فورٹ ولیم کالج کی لائبریری اپنے زمانے میں برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی لائبریری تھی اس میں میں ۱۸۳۵ع میں ۵۲۲۴ مطبوعہ مغربی کتابیں، ۱۱۷۱۸ مطبوعہ مشرقی کتابیں اور ۴۲۲۵ قلمی کتابیں تھیں۔" (۱۲)

کتابوں کی دیکھ بھال کے لئے کتب خانہ میں ایک مہتمم بھی بحال تھا۔ سب سے پہلے ۱۸۰۱ع میں منشی غلام حیدر اس عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد منشی موہن پرشاد اور پھر مولوی اکرام علی نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ (۱۳)

اس ادارے میں تعلیم و تعلم کے علاوہ طلبا کی لیاقت جانچ کا بھی انتظام تھا۔ ۱۸۰۱ع میں ولیم ہنٹر کو ہندوستانی کا ممتحن مقرر کرکے امتحان لیا گیا۔ (۱۴) پھر کامیاب طلبا کو اسناد و انعام دینے کے لیے ایک جلسہ ہوا جس میں شہر کے اکابر و عمائد بھی شریک ہوئے۔ کئی سال تک اس روایت کی پابندی کی گئی۔ تعلیم و تعلم کے علاوہ اس ادارے میں تصنیف، تالیف، تلخیص اور ترجمہ کا کام بھی ہوا۔ جس سے علوم شرقیہ میں بے بہا اضافہ ہوا۔

کالج کے فعال اور غیر فعال طور پر قائم رہنے کے سلسلے میں اکثر ادیبوں اور محققوں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ سید محمد (ارباب نثر اردو) محمد عتیق صدیقی (گل کرسٹ اور اس کا عہد) لچھمی ساگر وارشنیے (فورٹ ولیم کالج زبان ہندی) جاوید نہال (بنگال کا اردو ادب) اور عبیدہ بیگم (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات) نے کالج کی مجموعی عمر ترپن سال سے لے کر اٹھاون سال تک لکھی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے ترپن سال چھے ماہ چودہ دن کا شمار پیش کیا ہے۔ (۱۵)

اس کے برعکس عبدالغفور نساخ کی مولفہ اور ایک مستشرق ولیم ناسؤلیس

کی شائع کردہ کتاب (منتخبات دواوین شعرائے ہند) کا دیباچہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ کالج یکم نومبر ۱۸۶۴ء تک غیر فعالی حالت میں موجود تھا (۱۱۶) حالاں کہ محققوں نے مستند دستاویزوں کی روشنی میں عرصۂ حیات متعین کیا ہے تردید کی گنجائش نہیں رہتی لیکن ایک مستشرق کے ذریعہ شائع کی ہوئی کتاب میں درج ضمنی تحریر کو نظر انداز کرنا بھی ممکن نہیں، اس لیے فی الحال وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا یہ امر تحقیق طلب ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی اور تجارتی مقاصد کی بنا پر فورٹ ولیم کالج قائم کیا تھا لیکن غیر منصوبہ بند انداز سے یہ کالج علوم شرقیہ بالخصوص اردو زبان و ادب کی گوناگوں سرگرمیوں اور ارتقا کا ایک مرکز بن گیا جس سے اردو نثر کو نئی سمت و رفتار ملی بنگال میں اردو اور فارسی شعر و سخن کا چرچا عام ہوا طباعت و اشاعت کے مشینی دور کی ابتدا ہوئی اور کالج پریس سے کئی اہم کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں سرکاری سرپرستی پر نظر رکھتے ہوئے ارباب کلکتہ نے بھی کئی اردو پریس قائم کئے۔ کالج سے منسلک اور غیر منسلک مقامی ادیبوں نے مختصر مدت میں تصنیف تالیف ترجمہ، ترتیب، تسہیل اور تلخیص کا گرانقدر اور مثالی کام انجام دیا جب کہ مستشرقوں نے علمی و قواعدی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور ترجمہ میں دلچسپی لی اس کے علاوہ علمی و ادبی کارگزاریوں کی مجموعی نگرانی کی اس لیے فورٹ ولیم کالج انیسویں صدی میں اردو علم و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا

پبلک لائبریری: انیسویں صدی کی ابتدا میں کلکتہ کے خوشحال طبقے میں مشرقی و مغربی علم و ادب کا چرچا عام ہونے لگا تو اکابر و عمائد نے ۱۸۲۵ء میں ایک دار المطالعہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اس سلسلے کے بنیادی کام کے لیے ایک چوبیس نفری کمیٹی بنائی گئی جس میں یوروپین برادری کے مقامی افراد کے علاوہ دو ہندوستانی رکن بابو رسک کرشنا مالک اور بابو رادھا مدھو دتا تھے، اعزازی سکریٹری کے طور J H Storqueler نامزد ہوئے، جنہوں نے مقامی سطح پر مختلف حلقوں سے رابطہ قائم کرکے مالی امداد اور عطیہ کے خطی نسخے اور کتابیں حاصل کیں

ایک علم دوست ڈاکسٹر ایف، پی اسٹرانگ (سول سرجن، ضلع چوبس پرگنہ) نے اپنے مکان کی پہلی منزل لائبریری کے لیے مخصوص کردی، جس میں ضروری انتظامات کرنے کے بعد، کلکتہ پبلک لائبریری، قائم ہوئی اور ۲۱ مارچ ۱۸۳۶ ع سے عوام کے لیے کھول دی گئی

کچھ عرصہ بعد گورنر جنرل مٹکاف کے حکم سے فورٹ ولیم کالج کی چار ہزار چھ سو بچھتر کتابیں اور خطی نسخے مشروط طور پر لائبریری میں منتقل کئے گئے۔ ان میں دیگر علوم کے علاوہ مشرقی علوم والسنہ سے متعلق کتابوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ جولائی ۱۸۴۱ ع میں بعض وجوہ سے عارضی طور پر لائبریری کو فورٹ ولیم کے احاطے میں منتقل کردیا گیا لیکن جلد ہی اسٹرانڈ روڈ پر واقع مٹکاف ہال کی پہلی منزل میں کشادہ جگہ مل گئی اس میں کتابوں کے تحفظ اور عوام کے مطالعے کے لیے خاصی جگہ تھی۔ اس لیے انتظام کاروں نے نادر و نایاب کتابیں اکٹھا کرنے پر زیادہ توجہ کی۔

۱۹ ویں صدی کے وسط میں کلکتہ پبلک لائبریری، شمال مشرقی ہندوستان میں ایسے طــــرز کی واحد لائبریری تھی، جس میں بہت ہی منظم اور منصوبہ بند طریقے سے کتابیں اور خطی نسخے محفوظ بھی کئے جاتے تھے اور مطالعے کے لیے بھی فراہم کئے جاتے تھے۔

ایمپریل لائبریری۔ ۱۹ ویں صدی کے درمیانی دور میں کلکتہ کے شرفا کے درمیان لائبریری میں پڑھنے کا شوق اتنا عام ہوگیا کہ انگریزوں نے انتظامیہ کے تمام اہم دفتروں میں لائبریریاں قائم کردیں جس سے شوق مطالعہ کو اور ہوا ملی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آخری دہے میں ایک بڑی مرکزی لائبریری کی ضرورت محسوس کی گئی تو ۱۸۹۱ ع میں سرکاری فیصلے کے تحت مختلف دفتروں کی لائبریریوں کو ضم کرکے ایمپریل لائبریری، کلکتہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ضم ہونے والی لائبریریوں میں وزارت داخلہ کی لائبریری بہت اہم تھی کیوں کہ اس میں فورٹ ولیم کالج لائبریری اور ایسٹ انڈیا بورڈ، لندن کی لائبریری کی کئی اہم اور نادر کتابیں تھیں۔

ابتداءً ایمپیریل لائبریری کو مرکزی اور صوبائی افسروں کے لیے مخصوص و محدود

کردیا گیا تھا لیکن گورنر کرزن اسے عوام کے لیے بھی کھولنا چاہتا تھا، لہٰذا اُس نے ایک منصوبہ تیار کیا، جس کے تحت پبلک لائبریری، کلکتہ کے منتظمین سے تمام کتابیں اور دیگر نسخے خرید کر امپیریل لائبریری کے حوالے کردیئے گئے۔ توسیع کے دوسرے اقدامات بھی کئے گئے اور ۱۹۰۲ء میں ایک ایکٹ بناکر ۱۹۰۳ء میں اسے مرکزی سرکار کے زیر نگرانی دے دیا گیا۔

دستاویزوں اور دوسری تفصیلات سے علوم شرقیہ کی کتابوں کا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان ایام میں بنگال کے سول ملازمین اور دوسرے دیگر انتظامی کارکنوں کا مقامی زبانوں بالخصوص اردو فارسی سے گہرا لگاؤ تھا جو دراصل ان کی ملازمت ضروری تھی، اس لیے اغلب ہے کہ دفتری لائبریریوں میں علوم شرقیہ سے متعلق کچھ کتابیں ضرور ہوں گی جو فورٹ ولیم کالج لائبریری اور اسٹ انڈیا بورڈ، لندن کی کتابوں/خطی نسخوں کے ساتھ اس میں منتقل ہوئی ہوں گی۔

بوہار لائبریری (۱۷) شاہ عالم کے زمانے میں بوہار (ضلع بردوان) کے سید صدر الدین ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھے پھر میر جعفر کے میر منشی اور ولیعہد نجم الدولہ کے اتالیق بھی مقرر ہوئے لیکن وہ اپنے ان عہدوں کی وجہ سے یاد نہیں کیے جاتے بلکہ علوم شرقیہ کے محافظ اور شیدائی کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے ۱۷۷۵ء میں حلیلیہ مدرسہ اور حلیلیہ کتب خانہ بوہار میں قائم کیا تھا اس کتب خانہ کے لیے انہوں نے کثیر تعداد میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو کی گرانمایہ کتابیں اور خطی نسخے اکٹھا کیے تھے، جن کا تعلق مشرقی علوم، فنون، ادب اور مذہب سے تھا۔ تقریباً سوا سو برس تک مذکورہ مدرسہ اور کتب خانہ سے علوم شرقیہ کی تدریس، توسیع اور تحفظ میں مدد ملتی رہی۔ سیاسی حالات کی تبدیلی کا سماج پر منفی اثر پڑنے لگا تو اگست ۱۹۰۴ء میں سید صدر الدین کے وارثین نے حفاظتی نقطۂ نظر سے اس کتب خانہ کا تمام اثاثہ حکومت ہند سے ایک معاہدہ کرکے امپیریل لائبریری کے حوالے کردیا، جہاں اسے مٹکاف ہال کے ایک علاحدہ کمرے میں رکھوا گیا۔ اسی طرح ۲۰ ویں

صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی امپیریل لائبریری (۱۸) کے علوم و السنۂ شرقیہ کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ ہوا۔ (۱۹)

کلکتہ یونیورسٹی: سیاسی اور عسکری تدبر سے جب پورا ملک عملاً بیرونی حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا تو مشرقی علم و زبان کی جگہ مغربی علوم اور انگریزی زبان پر خاص توجہ دی جانے لگی اور تدریس و توسیع کے نئے ذرائع تلاش کئے گئے مدرسوں اور دوسرے مشرقی درسگاہوں میں آہستہ آہستہ بیرونی حکمرانوں کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ انگریزی طرز کی درسگاہیں وجود میں آنے لگیں۔ علاوہ بریں مغربی عالموں اور سائنس کے ٹیچروں نے کلکتہ کے خوشحال اور روشن خیال گھرانوں میں انگریزی زبان اور سائنس سکھانا شروع کیا جس سے نئی نسل میں مغربی علوم و السنہ کا شوق پیدا ہوا اور اعلا مغربی تعلیمات کے لیے زمین ہموار ہوئی۔ جلد ہی ایسی درسگاہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی جہاں اعلا سطح پر نئی تعلیم و تدریس کی شروعات ہو۔ چنانچہ کمپنی کی تعلیمی کونسل کے فیصلے کے مطابق ۱۸۵٦ ع میں کلکتہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی بنگال کے ہندو اور مسلمان اکابر نے علم پروری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی زمین اور جائداد کا معتدبہ حصہ یونیورسٹی کو عطیہ کے طور پر دیا جس کی بنیاد پر کیمپس بھی بنا اور مالی استقامت بھی آئی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے چانسلر وائس کاؤنٹ کننگ اور وائس چانسلر سر ولیم جانس کالول مقرر ہوئے۔ آرٹس سائنس کامرس اور میڈیکل سائنس کی چار فیکلٹیاں قائم ہوئیں۔ اسکول اور کالج کا الحاق ان دنوں یونیورسٹی سے تھا بالخصوص نصاب اور امتحان یونیورسٹی کے سپرد تھے۔

غالباً نئے طرز کے اسکولوں میں میٹرک کی سطح تک اردو کی تعلیم کا انتظام تھا جس کی طرف گارساں دتاسی کے ۱۸٦۲ ع کے ایک خطبے سے واضح اشارہ ملتا ہے:

"۔۔۔۔۔ کتاب کا نام "منتخبات اردو" ہے۔ یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے ۔۔۔۔۔ "منتخبات اردو" کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی گئی ہے۔

اس میں الف لیلیٰ میں سے سندباد جہازیؔ کا دلچسپ قصہ بھی لیا گیا ہے ۔ ... تحفۂ اخوان الصفا کے بعض حصے بھی طبع ہوئے ہیں ۔ ... فردوسیؔ کے شاہ نامہؔ کا اسی بحر میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور اس ترجمے کے ۶۰ صفحے ہیں درد کی غزلوں کے اقتباسات ہیں ۔ ۔ گلستاں اور اخلاق جلالی کے بھی اقتباسات ہیں ، (۲۰)

ایک اور کتاب بنگال کے نامور تذکرہ نگار اور شاعر عبدالغفور نساخ نے یونیورسٹی کے لیے مرتب کی تھی ، جس کا نام « نصاب زبان اردو » ہے اس کے دو حصے ہیں حصۂ نثر بہادر علی حسینی کی تالیف « نثر بے نظیر » سے ماخوذ ہے ، اس کی طباعت کالج پریس (بشپ کالج پریس) کلکتہ سے ٹائپ میں ستمبر ۱۸۶۲ع میں ہوئی تھی جب کہ حصۂ نظم میں چند مشہور شاعرں کی غزلوں ، قصیدوں اور قصیدۂ شہر آشوب کو شامل کیا گیا ہے یہ بھی ٹائپ میں مذکورہ بالا پریس سے ۱۸۶۳ع میں چھپا تھا اسے « منتخبات دواوین شعرائے ہند » کے نام سے بھی نامور مستشرق ناسولیس نے اپنے انگریزی دیباچہ کے ساتھ اسی پریس سے ۱۸۶۴ع میں شائع کیا تھا ۔ قیاس ہے کہ یونیورسٹی کے نصابی تقاضوں کی بنا پر اسے دوبارہ علیٰحدہ شائع کیا گیا ہوگا ۔ سید محمد عبدالغفور شہباز نے بھی ایک نصابی کتاب « نور خرد » مرتب کی تھی جو پہلی بار ۱۸۸۴ع میں مطبع وطن ، کلکتہ سے چھپی تھی گارساں دتاسی نے ایک اور کتاب کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے :

« اردو کا جوں ، کے عنوان سے بابو شیو پرشاد نے کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لیے ایک انتخاب شائع کیا ہے اس میں شکنتلا کی کہانی ، افسوس کی آرائش محفل کے اقتباس اور گنج خوبی مترجمۂ اخلاق محسنی کے اقتباس شامل ہیں ۔ نجم الاخبار اور علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (بابت ۳ اپریل ۱۸۷۴ع) میں اس انتخاب پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے خصوصاً شکنتلا اور آرائش محفل پر یہ کہہ کر اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کی زبان غیر فصیح ہے اور بڑی حد تک متروک ہوچکی ہے ، (۲۱)

بہرحال نصابی کتابوں کی اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور

ہندوؤں نے سرگرمی کے ساتھ یونیورسٹی کے طلبا کے لئے کتابیں ترتیب دیں لیکن شروع میں مسلمان نئے طرز تعلیم سے بالکل الگ رہے۔ گارساں دتاسی کا درج ذیل بیان حقائق پر مبنی ہے :

" ...... بنگال میں یونیورسٹی کی ڈگری کے اعـــزاز کو بہت اہمیت دی جارہی ہے ... اس سال پندرہ سو نوجوان ہندوستانی جو سولہ سال یا کچھ زیادہ عمر کے تھے اور ۴۴۷ دوسرے طلبہ امتحان کے لیے جمع ہوئے .... یہ طلبہ سب ہندو تھے۔ ان میں مسلمان نام کو نہیں یونیورسٹی کی سند مسلمانوں کے لیے ابھی اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی۔" (۲۲)

لیکن یونیورسٹی کی تعلیم سے علیحدہ رہنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ۱۸۲۹ ع سے مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے نصاب میں انگریزی بھی شامل کی گئی اور آہستہ آہستہ مسلمانوں نے اسے قبول کرلیا۔ اس لیے وہاں سے فارغ ہونے والے مشرقی و مغربی زبانوں پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ ملازمت میں بھی سہولت اور فوقیت تھی، جس کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم انہیں فوری طور پر متاثر نہ کرسکی۔

بہرحال کلکتہ یونیورسٹی میں میٹرک کی سطح تک اردو تھی اور دوسری مشرقی زبانوں پر توجہ نہیں دی گئی۔ شاید میکالے کی تعلیمی اصطلاحات کے زیر اثر ایسا ہوا ہو۔ اسی دوران میں معروف مستشرق ناسولیس نے اعتدال کے ساتھ حکمرانوں کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور میکالے کی انتہا پسندانہ تجویزوں کی مخالفت کی۔

کچھ مہینے ہوئے ہیں کہ ایک ہوشیار انگـــریز مستشرق مسٹر نسولیس (Nassau Less) نے جو اپنی عربی عالمانہ تالیفات کے لیے بہت کچھ مشہور ہوئے ایک رسالہ السنۂ مشرق کی حمایت میں تصنیف کیا۔ لارڈ میکالے نے جو اصطلاحات نظـام تعلیم کے متعلق پیش کی تھیں اور جن کی تائید ٹائمز نے کرتے ہوئے اس پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں صرف لاطینی حروف استعمال کئے جائیں اور آئندہ سے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے۔ نسولیس کے خیال میں یہ تحریکات تحصیل علـوم شرقیہ کے حق میں مضر اور خطرناک ہیں ... خاتمۂ کتاب میں وہ

انگلستان کے سیاسی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جملہ السنۂ مشرقیہ کی تحصیل کی حمایت کرتا ہے ۔ (۲۳)

یونیورسٹی کی تعلیمات میں اعتدال پسندوں کی عروج ہوا تو حالات میں تبدیلی آنے لگی پھر ۲۸ جنوری ۱۸۸۲ء کو سنڈیکیٹ کی نشست میں مغربی زبانوں کے علاوہ عربی فارسی، اردو، سنسکرت اور بنگلہ کے مطالعہ جاتی بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ ہوا یکم مارچ ۱۸۹۱ء کو آشوتوش مکھرجی نے آرٹس فیکلٹی میں اردو، ہندی اور بنگلہ کے ایف اے، بی اے۔ اور ایم۔ اے۔ کے امتحان منعقد کرانے کی تجویز رکھی اور مقامی و غیرمقامی عربوں کے تعاون سے اسے منظور کرالیا۔ اس کے بعد اس سلسلے کا بنیادی کام شروع کیا گیا نصابی کمیٹی بنانے کے علاوہ لائبریری میں کتابیں اکٹھا کی جانے لگیں لیکن مذکورہ درجوں میں درس و تدریس کے انتظام کی مزید تفصیل دستیاب نہ ہوسکی مسلمانوں کے ذریعہ ایک کالج قائم ہوجانے سے گمان غالب ہے کہ ایف اے۔ اور بی۔ اے کی سطح کی تعلیم شروع ہوگئی ہوگی مگر ایم اے کا تدریسی مرحلہ بیسویں صدی میں طے ہوا ہوگا

کلکتہ یونیورسٹی کو علوم و السنۂ شرقیہ کا ایک ایسا ادارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں مشرقی علوم کے مغربی طرز پر مرتب کرنے، اور محفوظ کرنے اور درس دینے کی بنیاد ڈالی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں نئی لیاقتی سندوں سے جوڑا گیا۔

پریسیڈینسی کالج پریسیڈینسی کالج کے روح رواں نواب عبداللطیف (عبدالغفور نساخ کے بڑے بھائی) تھے وہ نہ صرف انگریزی مضمون کے ساتھ مدرسہ عالیہ، کلکتہ سے فارغ ہونے والے پہلے مسلمان طالب علم تھے بلکہ بنگال کے مسلمانوں میں پہلے گریجویٹ بھی تھے۔ وہ سر سید کی علی گڑھ تحریک اور سائنٹی فک سوسائٹی سے بہت متاثر تھے۔ سرسید کے قیام کلکتہ کے دوران میں بھی وہ نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہوں نے مقامی مسلمانوں کے تعاون اور غالباً تحریک کے نمائندوں کے مشورے سے محمڈن کالج، علی گڑھ کے طرز پر فروری ۱۸۷۳ء میں پریسیڈینسی کالج قائم کیا اس کا احاطہ کلکتہ یونیورسٹی کیمپس کے بغل ہی میں تھا۔ اس میں مغربی علوم اور زبان کے علاوہ مشرقی علوم و السنہ کی تدریس

ہوا کرتی تھی۔ غالباً عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ اسلامیات پر بھی توجہ دی گئی تھی۔ ایک عرصہ تک اس ادارے کی حیثیت پورے صوبے میں مرکزی رہی اور تعلیم و تدریس کے معاملے میں اس قدر شہرت ہوئی کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں سرکار نے اُسے اپنی تحویل میں لے لیا پر چند آہستہ آہستہ شرقی علوم و السنہ کی اہمیت کم ہوگئی اور انگریزوں کی نگرانی میں سائنس پر زیادہ دھیان دیا گیا لیکن یہ سلسلہ آزادی تک برقرار رہا۔ آزادی کے بعد وہاں مذکورہ بالا شعبوں کو بند کردیا گیا اور عربی فارسی، اردو اور اسلامیات کی تمام کتابیں مولانا آزاد کالج (سابق اسلامیہ کالج جسے ۲۰ویں صدی کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا اور بعد میں سرکاری تحویل میں چلا گیا۔) لائبریری میں منتقل کردیا گیا۔ ان شعبوں کے اساتذہ کی جگہوں کو بھی ختم کردیا گیا اور موجود اساتذہ کو دوسرے سرکاری کالجوں میں بھیج دیا گیا جس سے اس معروف ادارے سے علوم و السنۂ شرقیہ کا مکمل اخراج ہوگیا۔

آخر میں ضمنی طور پر ان نوابوں اور مقامی ہندو راجاؤں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی ذات سے ادارہ تھے۔ مختلف سطحوں پر مشرقی علم و ادب کی والہانہ سرپرستی اور تحفظ میں سرگرم رہنے والوں میں واجد علی شاہ کا نام سرفہرست ہے انہوں نے اپنی سکونت مٹیا برج (۱۳ مئی ۱۸۵۶ع۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ ع) کے دوران میں وہاں مدرسۂ شاہی قائم کیا جس میں درباریوں اور لواحقین کے بچوں کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ درس نظامیہ کے مطابق عربی، فارسی، اردو اور دیگر علوم کا درس دینے کے لیے اچھے اساتذہ متعین کیے گئے تھے۔ ایک زمانے میں سید علی حیدر نظم طباطبائی بھی اس مدرسہ سے وابستہ تھے۔

واجد علی شاہ نے نہ صرف شعراء و ادباء کی حوصلہ افزائی کی اور شعر و ادب اور علوم و فنون کی مختلف النوع کتابیں/خطی نسخے جمع کئے بلکہ طباعت و اشاعت پر بھی توجہ دی۔ ان کے حکم سے مطبع سلطانی کا قیام عمل میں آیا جہاں سے سیکڑوں علمی ادبی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئیں۔ واجد علی شاہ نے کلکتہ آنے کے بعد پچاس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں بیشتر کی طباعت اسی پریس سے ہوئی ہے ضیائے اختر، حزن اختر اور دلہن کو اس زمانے میں

خاصی مقبولیت ملی تھی۔

۱۷۹۹ ع کے وسط میں سقوط میسور اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے شہزادوں اور شاہی خاندان کے دیگر افراد و متعلقین کو کلکتہ کے قریب ایک ویران علاقے میں لاکر قید کردیا تھا جو دراصل سندر بن کا حصہ تھا۔ بعد میں اس علاقے کا نام ٹالی گنج پڑا جہاں ان افراد نے اپنے محدود وسائل کے باوجود علم و ادب کا چراغ جلایا اور بہت جلد شعر و سخن کا ایسا ماحول بنایا جس میں احمد علی گوپاموئی مولف «حملات حیدری» اور محمد علی داؤد باداں مصنف «نظم بہار» کی ایسی طبیعت لگی کہ وہیں کے ہورہے وہاں کے مشاعروں میں غالب، نظم طباطبائی، برق لکھنوی، عبدالغفور نساخ اور رشیدالنبی وحشت کے کئی مقامی شاگرد شرکت کرتے تھے

مقامی رجواڑوں میں شوبھا بازار خاندان اور ملک خاندان کے کئی راجاؤں نے اردو فارسی شعر و ادب کی سرپرستی بھی کی اور خود بھی شعر و نثر میں جوہر دکھائے (۲۴) شوبھا بازار کے یادو راجوں میں اپور دیب بہادر کنور کالی کرشنا دیب بہادر راجا، جادب کرشنا دیب بہادر شفیق اور چندر گھوش کشن نے قابل قدر مثنویاں اور غزلیں کہی ہیں۔ کالی کرشنا کی فارسی و اردو تصانیف میں «احسن المواعظ» «مجمع اللطائف» «قصہ کامروپ» اور «منثور منظوم» کا ذکر ملتا ہے، کشن کی فارسی تالیف «منتخب المواعظ» کو بنگال میں کافی شہرت ملی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے

ملک گھرانے کے کانستھ راجاؤں میں جگن ناتھ پرشاد ملک اور جسم جی متر ارماں مقامی طور پر خاصے مشہور ہوئے ارماں سے شعرائے اردو کے دو تذکرے «منتخب التذکرہ» (مولفہ ۱۸۴۹ع) اور «نسخہ دلکشا» (مولفہ ۵۴-۱۸۵۲ع)(۲۵) یادگار ہیں — مذکورہ دونوں خاندان کے ذاتی کتب خانوں میں عربی، فارسی اور اردو کی کمیاب کتابیں خطی نسخے تھے جو امتداد زمانہ کے ساتھ تلف ہوگئے۔ بچی کھچی کچھ چیزیں ان کے وارثوں نے ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ کی ہیں۔

نئے تعلیمی رجحان سے متاثر ہونے کی بنا پر ۱۹ویں صدی کے نصف آخر

حتے کلکتہ کے مسلمانوں میں نیا علمی شعور پیدا ہوا جسے مولوی عبداللطیف جیسے کثیرالجہات شخص نے مزید ہوا دی اور مقامی و غیرمقامی دانشوروں کے اشتراک سے ۱۸۶۳ع میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ محمد حسین آزاد نے اپنے مقالات میں اس سوسائٹی کا نام (انجمن اسلامی) کلکتہ، لکھا ہے جب کہ گارساں دتاسی نے (انجمن اسلامیہ) (۲۷) اور (انجمن ادب) (۲۸) تحریر کیا ہے اس کی مجلس منتظمہ میں بنگال کے گورنر سر ولیم گر، کورٹ کے جج عبدالباری، مولوی عباس علی خاں، ڈاکٹر میر اشرف علی، مرزا احمد بیگ، مولوی عبدالرؤف، منشی سید لطافت حسین وغیرہ تھے سوسائٹی کا بنیادی کام مسلمانوں کو سائنس کے نئے انکشافات اور علوم مختلفہ کے نئے میلانات سے آگاہ کرانا تھا تاکہ وہ ان کی تحصیل کے لیے کوشاں ہوسکیں۔ گارساں دتاسی نے اس کی کارکردگی کے سلسلے میں لکھا ہے :

(کلکتہ کی انجمن اسلامیہ بڑے شوق سے علمی خدمت انجام دے رہی ہے بنگال کونسل کے رکن مولوی عبداللطیف خاں بہادر نے آج سے چودہ سال پہلے اس کی داغ بیل رکھی تھی اور وہی اس کے سکریٹری ہیں مہینے میں ایک بار اس کا جلسہ ہوا کرتا ہے۔ انجمن کا مقصد ہے کہ بلا قید زبان، مسلمانوں کو علمی و ادبی تحریکوں سے باخبر رکھے۔ اس کوشش سے مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بڑھ گیا ہے اور اس کے جلسوں کا ہر طرف چرچا ہے۔) (۲۹)

اس سوسائٹی کا ایک ترجمان (دوربین) فارسی زبان میں نکلتا تھا (۳۰) جس میں دیگر مشاہیر کے علاوہ سید محمد آزاد (مصنف ڈرامانہ نوابی دربار) کی تحریر بھی شائع ہوتی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے داروں نے فورٹ ولیم کالج کے عمل و حرکت میں کمی آنے کے بعد ایک محدود علمی ادارہ (ایجوکیشنل کمیٹی) ۱۸۳۵ع میں قائم کیا اس کے اغراض و مقاصد میں مشرقی زبانوں کی بنیادی کتابیں تیار کرانا اور اہم کتابوں کا ترجمہ کرانا بھی تھا۔ لیکن فنڈ کی کمی اور بے توجہی کے سبب منصوبہ کے مطابق کام نہیں ہوسکا پھر بھی سنسکرت اور بنگلہ کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو میں کئی کتابیں تیار یا ترجمہ کرائی گئیں۔

علم و ادب اور شعر و سخن کے ایسے محدود اداروں اور آماجگاہوں سے اسلاف کی صالح اور توانا روایت مضبوط ہوئی اس کی جڑیں ہر چہار طرف پھیلیں اور علمی و ادبی ورثے کا تحفظ بھی ہوا ان اداروں اور آماجگاہوں کا اصل تعلق بعض شخصیتوں سے تھا اور لائحۂ عمل یا تو تھا ہی نہیں یا بہت محدود تھا، اس لیے کسی خاص نہج پر ایسا نمایاں اور ٹھوس کام نہیں ہوا کہ اس کی وجہ سے ان کی پہچان بنے لیکن اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ علوم شرقیہ کے ان ہی بے ترتیب قمقموں کی روشنی سے کلکتہ کے مرکزی ادارے جگمگا اٹھے۔ لہٰذا انہیں مرکزی اداروں کے علوم و السنۂ شرقیہ کا Feeder کہا جاسکتا ہے۔

• •

کتابیات

(حواشی و منابع)

(١) ہسٹری آف مدرسہ ایجوکیشن، ص ٨٩، ڈاکٹر محیب الرحمٰن کلکتہ، ١٩٧٧ء

(٢) مقالات گارساں دتاسی، ص ٧٧، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ١٩٤٣ء

(٣) بحوالہ سینٹیری ریویو آف دی ایشیاٹک سوسائٹی (پہلا حصہ) ڈاکٹر راجندر لال مترا، کلکتہ، ١٩٨٦ء

(٤) ١٨٣٣ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے جونیر سول ملازم کو رائیٹر (Writer) کہا جاتا تھا انتظامی امور کے لیے ١٧٨٠ء میں وورٹ ولیم کے نزدیک (سابق ڈلہوزی اسکوائر، موجودہ بنے بہاری دبیش باغ) ایک تین منزلہ عمارت بنوائی گئی تو اسی رعایت سے اس کا نام Writers' Building رکھا گیا۔

(٥) گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ٨٨، محمد عتیق صدیقی، نئی دہلی، ١٩٧٩ء

(٦) بحوالہ ایضاً، ص ١٣٥

(٧) گل کرسٹ اینڈ دی لینگویج آف ہندوستانی، ص ١٤، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی، نئی دہلی، ١٩٧٢ء

(٨) کلکتہ کے آگے ہگلی ندی کے دکھن پوربی کنارے کا علاقہ گارڈن ریچ کہلاتا

تھا۔ اب کلکتہ عظمہ کا حصہ ہے اور خضر پور سے مٹیا برج تک پھیلا ہوا ہے۔

(٩) قیاس ہے کہ لال بازار تھانے کی موجودہ احاطے کی قدیم عمارت رہی ہوگی۔

(١٠) بحوالہ ڈان آف نیو انڈیا، ص ١٠٠، بی۔ این۔ بنرجی، کلکتہ، ١٩٢٧ع

(١١) خطبات گارساں دتاسی، ص ٣١ (چوتھا خطبہ، ٢٩ نومبر ١٩٥٣ع) اورنگ آباد (دکن) ١٩٣٥ع

(١٢) فورٹ ولیم کالج، تحریک و تاریخ، ص ٢٠٩، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، طبع دوم، لاہور، نومبر ١٩٨٨ع

(١٣) بحوالہ فورٹ ولیم کالج اور مولوی اکرم علی، ص ١٤٦، نادم سیتاپوری، لکھنو، ١٩٥٩ع

(١٤) بحوالہ بنگال میں اردو زبان و ادب، ص ٢١، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، لکھنو، ١٩٧٦

(١٥) (الف) انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے، ص ٤٧، ڈاکٹر سمیع اللہ، فیض آباد، اکتوبر ١٩٨٨ع (ب) فورٹ ولیم کالج۔ایک مطالعہ، ص ٤٧، ڈاکٹر سمیع اللہ، فیض آباد، اپریل ١٩٨٩ع

(١٦) تفصیل کے لیے راقم السطور کا مضمون «منتخبات۔ایک کمیاب کتاب» دیکھا جاسکتا ہے۔

(١٧) بوہار (ضلع بردوان) کلکتہ سے خاصا دور ہے۔ وہاں کا اہم ذخیرۂ کتب ٢٠ویں صدی کی ابتدا میں ایمپریل لائبریری میں منتقل ہوا تھا، اس لیے بوہار لائبریری کا مختصر ذکر ناگزیر تھا۔

(١٨) آزادی کے بعد گورنر جنرل سی۔ راج گوپال اچاریہ کی تجویز پر ایمپریل لائبریری کا تمام اثاثہ محلہ خضر پور میں واقع اس بنگلے میں منتقل کر دیا گیا جس میں انگریز گورنر یا وائسرائے رہا کرتے تھے۔ اس بنگلے کو لائبریری بنانے کے بعد نئے قانون و ضابطہ کے مطابق اس کا نام نیشنل لائبریری

رکھا گیا اور یکم فروری ۱۹۵۳ع سے عوام کے لیے اسے کھول دیا گیا۔

(۱۹) اب تک نیشنل لائبریری کے عربی، فارسی اور اردو سیکشن میں Buhar Collection کی دقت کے ساتھ ساری کتابیں الگ رکھی ہوئی ہیں۔

(۲۰) خطبات گارساں دتاسی، ص ۳۴ - ۳۲۳ (بارہواں خطبہ، یکم دسمبر ۱۸٦۲ع)

(۲۱) مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم) ص ٥٦ - ٥٥ (۱۸۷۱ع کا مقالہ)

(۲۲) خطبات گارساں دتاسی، ص ٥۲ - ٥٥۱ (سولہواں خطبہ، ۳ دسمبر ۱۸٦٦ع)

(۲۳) ایضاً ص ۳۸ - ۲۳۷ (آٹھواں خطبہ، ۱۰ دسمبر ۱۸٥۷ع)

(۲۴) تفصیل کے لیے راقم السطور کا تحقیقی مضمون (بنگالی ہندو شعرا کی غزلیہ شاعری ، مطبوعہ (آج کل) نئی دہلی ، جنوری ۱۹۸٦ع دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲٥) راقم السطور نے دونوں تذکرے بالترتیب کلکتہ سے ۱۹۷۹ع میں اور پٹنہ سے ۱۹۸۹ع میں شائع کردیئے ہیں

(۲٦) مقالات محمد حسین آزاد (حصہ اول) ص ۱۱۳، لاہور، ۱۹٦٦ع

(۲۷) مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم) ص ۳۷۴

(۲۸) ایضاً ص ۲۹۲

(۲۹) ایضاً ص ۳۷۴

(۳۰) گلدستہ اودھ پنچ، ص ۱۰۷، مرتبہ پنڈت کشن پرشاد کول، لکھنؤ، ۱۹۱٥ع

●

1. Annals of the College of Fort William by T Roebuck, Calcutta, 1819
2. Centenary Review of the Asiatic Society (1st Part) by Dr Rajendralal Mitra, Calcutta, 1986.
3. History of Madrasah Education by Dr Mojibur Rahman, Calcutta, 1977
4. India's National Library by B S. Kesavan, Calcutta, 1961
5. Proceedings of the Asiatic Society, Calcutta, July 1870
6. The College of Fort William in Bengal by Bulmer, London, 1805.
7. The Modern History of Indian Chieves, Rajas, Zamindars by Loknath Ghosh, Calcutta, 1881.

● ● ●

کتابی دنیا

آثار و افکار

(مولفہ سید سجاد حسین)

تبصرہ از

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

مدراس یونیورسٹی ہندوستان کی پہلی تین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے جسکا قیام ۱۸۵۳ء میں عمل میں آیا اور جہاں انگریزی زبان کے ساتھ مقامی زبانوں کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور اس یونیورسٹی میں پرنسپل سید عبدالوہاب بخاری، پروفیسر یوسف کوکن، پروفیسر سید وحید اشرف اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ جیسے استادوں نے اردو کے کاز کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اور خصوصاً مدراس، کیرالا اور دیگر ملحقہ صوبوں میں عربی زبان کا اثر رہا اور یہ اثر دخیل الفاظ کی صورت میں یا عربی رسم الخط کے روپ میں تمل یا ملیالم زبانوں میں نظر آتے لگا حتیٰ کہ دور وسطیٰ میں مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی زبان کے غلبہ نے ہندوستان کی تمام زبانوں کو متاثر کیا اور صوفیائے کرام نے تصوف کے فلسفہ کو ہندو مسلم اتحاد کی علامت سمجھکر اپنے افکار و خیالات کو مقامی زبانوں کے ذریعے پیش کیا اور اس طرح بالفعل ایک رابطہ کی زبان (اردو) یا (دکنی) کا وجود عمل میں آیا اور یہی عوامی زبان بالخصوص صوفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنی اور آج بھی تمل ناڈو اور کیرالا میں خصوصی طور پر مقامی زبانوں کے ساتھ اردو بھی بطور زبانِ عمومی یا زبان رابطہ استعمال ہورہی ہے۔

ڈاکٹر سید سجاد صاحب ہے جو مدراس یونیورسٹی کے اردو، فارسی و عربی کے شعبہ میں کوئی ایک دہے سے ایک اچھے استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں اپنی تالیف "آثار و افکار" کو پیش کر کے اردو کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل سجاد صاحب جیسے ادیب کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے تھے۔

زیر نظر تالیف کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں تمل ناڈو میں اردو زبان میں شعری و نثری ادب کے ارتقا کے بارے میں اچھی معلومات ملتی ہیں اور حقیقت میں یہ کتاب پرستاران اردو کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی مدد سے تحقیق و تحلیق یا تنقید و تجزیہ کے سلسلہ میں اردو کی زبردست خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔

زیر تبصرہ تصنیف "آثار و افکار" میں فاضل مصنف نے شاہ تراب چشتی جیسے تمل ناڈو کے معروف صوفی شاعر پر اپنے تاثرات اسطرح پیش کئے ہیں کہ شاہ تراب صاحب کے صوفیانہ مسائل اور خیالات کا اظہار زبان "دکنی" یا "اردو" میں نظم کی صورت میں ایک بزرگ صوفی شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے اور اسی طرح مولف موصوف نے قاضی بدرالدولہ کی نثری خدمات کا جائزہ لیا ہے اور ان کو اردو نثر کے معمار اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تمل ناڈو کے مشاہیر شعرا میں خالص، اسرار اور مسحور کی شعر و شاعری پر قلم اٹھایا ہے اور اس طرح مدراس کی موجودہ شعر و شاعری اور انشائیہ و افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے خزانہ میں بڑا اضافہ قرار دیا ہے آخیر میں نواب محمود کی ادبی شخصیت اور شعر و شاعری پر روشنی ڈالی ہے اور انور رمانی کو ایک مفکر ادیب اور علیم صبا نویدی کو ایک نعت گو شاعر قرار دے کر انکی رومانی نظموں پر مفصل بحث کی ہے اور حسن فیاض کی شخصیت اور ان کے فن پر کافی روشنی ڈالی ہے اور آخر میں دور حاضر کے شعرا کا تذکرہ بھی بڑی حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف موصوف کے تاثرات اور ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کے ارتقا میں تمل ناڈو کا کتنا حصہ ہے اور اس تعلق سے اردو کے مختلف اصناف پر تحقیقی

کام کیا جاسکتا ہے اور اردو کے خزانے میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

امید ہے کہ ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب کی قابل قدر تالیف «آثار و افکار» کی خوب پذیرائی ہوگی اور انکی کاوشیں اردو کے تعلق سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جائینگی۔ ہم ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں اس توقع کے ساتھ کہ وہ اس موضوع پر مزید مواد فراہم کر کے اردو کے محققین کو شکریہ کا موقعہ عطا کرینگے۔

یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، بمبئی (۸) اور تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس (۲) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

•

اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر

(مصنفہ حامد اللہ ندوی)

تبصرہ از

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی علمی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ انجمن اسلام جیسے ہندوستان گیر شہرت یافتہ ادارہ سے آپ ایک مدت سے وابستہ رہے ہیں۔ ابتدا میں ایک معلم کی حیثیت سے منسلک رہے بعد میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کتابدار کے ناطے کام کیا اور جلد ہی بمبئی یونیورسٹی کے عربی شعبہ میں ریڈر کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔ سبکدوشی کے بعد سے انسٹی ٹیوٹ میں رفیق کار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بڑے منکسر المزاج اور صلح کل کے حامل ہیں۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں اور عموماً رسائل و جرائد میں لکھتے رہتے ہیں۔ دنیائے ادب میں انکی تالیفات کی عموماً پذیرائی ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب بنام «اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر» انکی تازہ

پیش کش ہے جو انکے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فاضل مصنف نے سید سلیمان ندوی، قاضی عبد الغفار، احتشام حسین، عبد القادر سروری، سیدنجیب اشرف ندوی، فیض احمد فیض، جان نثار اختر، کیفی اعظمی، گوپال متل جیسی ادبی شخصیتوں کے بارے میں بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر اپنی نوعیت کا ایک الگ مضمون ہے جس میں تنقید و تجزیہ کے ساتھ تحقیق و تحلیل کی جھلک دکھائی دیتی ہے دراصل مصنف موصوف نے انکی شخصیات سے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات بیان کئے ہیں اس سے ان مضامین کی قدر و قیمت دو چند ہوگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ تصنیف صرف تحقیق و تنقید سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس میں ادیبوں اور شاعروں کے خاکے بھی ملتے ہیں اور مصنف موصوف کے حالات زندگی بھی

مہاراشٹر کالج (ممبئی) کے شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر نور السعید اختر سوداگر نے ابتدائیہ میں اپنے تعارفی کلمات میں کتاب کے مصنف اور انکے علمی اور ادبی کارناموں پر بہت اچھی روشنی ڈالی ہے اور انکے اُن مشاہدات و تجربات پر اچھے انداز میں بحث کی ہے جس کی بدولت یہ مضامین وجود میں آئے۔

المختصر زیر تبصرہ کتاب کے مصنف ایک اچھے ادیب و محقق ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور انکی دلچسپیاں گوناگوں ہیں۔ انکی تالیفات «لکھنؤ کی اسلامی خدمات»، «ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے تجارتی تعلقات» اور «کتب خانہ جامع مسجد ممبئی میں اردو مخطوطات» قابل ذکر ہیں جو اسلامیات، ثقافت اور مخطوطات سے متعلق ہیں

امید ہے کہ زیر نظر کتاب بھی پچھلی تالیفات کی طرح مقبول ہوگی اور قارئین و قلمکاران اس سے مستفید ہونگے۔ اگرچہ قیمت قدرے گراں ہے تاہم یقین ہے کہ اسکی پذیرائی ہوگی

یہ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

کلمات

(مرتبہ سید عبدالرحیم)

تبصرہ از

ڈاکٹر حامداللہ ندوی

« کلمات » ڈاکٹر سید عبدالرحیم کے ایسے چھوٹے بڑے مضامین کا مجموعہ ہے جن کو بہ حیثیت عموعی تین موضوعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی، ادبی اور شخصیاتی۔

چند تاریخی مضامین کے عنوان یہ ہیں (۱) ارادت خان واضح کی ایک تصنیف کلمات (۲) جامع مسجد اچلپور کا ایک نادر کتبہ جات (۳) قرون وسطی کے مسلم سکے اور کتبے، اور (۴) خانوادہ عنایت الٰہی نقشبندی بالاپوری کے علمی کارنامے

ادبی مضامین کے چند عنوان یہ ہیں (۱) وحدی کا مرثیہ اسمعیل خاں پنی (۲) علامہ اقبال اور نظریہ تعلیم (۳) وفا ایلچپوری اور اُن کا کلام (۴) حافظ محمد ولایت اللہ حافظ اور انکی شاعری اور (۵) طروہ قریشی اور اُن کی شاعری۔

شخصیاتی مضامین کے عنوان ذیل میں درج ہیں

(۱) ناظم انصاری کی یاد میں (۲) ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی۔ ایک علمی شخصیت اور (۳) باتیں ایک شاعر (مدحت الاختر) کی۔

کتاب کی ابتدا میں مصنف کا « عرض حال » ہے اور ڈاکٹر عبدالرب عرفان کا « پیش گفتار » ان سارے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ سب بڑی محنت اور عرق ریزی سے قلم بند کئے گئے ہیں

ڈاکٹر سید عبدالرحیم اپنی علمیت اور پیشہ کے اعتبار سے ایک گوناگوں شخصیت کے مالک ہیں، اُن کی پوری زندگی سرکاری ملازمت میں گزری ہے۔ پہلے انہوں نے محکمۂ آثار قدیمہ ناگپور میں ایک کتبہ شناس کی حیثیت سے کام

کیا، پھر وہ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسیز، (ناگپور) میں عرصے کے پروفیسر رہے اور آخر میں وسنت راو نائک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسیز، (ناگپور) کے ڈائرکٹر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے کئی تحقیقی اور ادبی کتابیں تالیف کی ہیں۔

اس طرح مختلف علمی ادبی اداروں میں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اُن کا تجربہ وسیع، تحقیقی ذوق منجھا ہوا اور مشاہدہ گہرا ہے۔ یہ کتاب اُن کی اس زندگی بھر کے مشاہدوں، تجربوں اور کارناموں کا نچوڑ ہے اور ہمیں اس میں اُن کی علمی ادبی شخصیت کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

اس کتاب کو مدرسہ مدینۃ العلوم، صدر، ناگپور نے شائع کیا ہے۔

• • •

Edited by Prof Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam's Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B Com (Hons)
General Secretary
Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008

مقالات

اسلامیات

جمیل الرحمن قاسمی

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی

(برہان دہلی، نومبر دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۷، شمارہ ۵۔۶، ص ۲۸۔۳۲)

وحید الزماں کے حالات زندگی اور اُن کی شخصیت کے کچھ پہلو۔

شاہد اسلم قاسمی

سرزمین اسپین کا ایک نامور عالم ابو حیان

(برہان دہلی، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۷، شمارہ ۵۔۶، ص ۲۲۔۲۷)

ابو حیان کے حالات زندگی اور اس

کی علمی خدمات کا جائزہ۔

شمیم الحسن امانت اللہ

المازنی اپنے ادب کے آئینے میں

(برہان دہلی، نومبر دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۷، شمارہ ۵۔۶، ص ۱۷۔۲۱)

جدید عربی ادب کے ایک نامور فنکار المازنی کا تعارف اور اس کی ادبی خدمات کا جائزہ۔

صدیقی محمد یاسین مظہر

بنو عبد مناف۔ عظیم تر متحدہ خاندانِ رسالت

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۶، جلد ۱۸۰، شمارہ ۲، ص ۸۵۔۱۰۶)

خاندان بنو عبد مناف کی تاریخ اور

مکہ و مدینہ کی معاشرت میں اُن کی اہمیت کا تفصیلی تذکرہ۔

قاضی اطہر مبارکپوری

مدون فتاوی عہد بہ عہد

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵٦، شمارہ ٦ ص ۴۰۵-۴۱٦)

رسول اللہ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے وقتاً وقتاً اسلامی مسائل پر جو فتاوے دیے اُن کا عہد بہ عہد جائزہ

عتیق احمد بستوی

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں

(الفرقان لکھنو، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۵، جلد ٦۳، شمارہ ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲)

یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی کوششوں پر ایک اسلامی اور تنقیدی نظر

عتیق الرحمٰن سنبھلی

ویدک دھرم اور اسلام

(الفرقان لکھنو، فروری ۱۹۹٦ ع، جلد ٦۴، شمارہ ۲ ص ۳٦-۳۸)

ویدک دھرم اور اسلام کے درمیان چند مشترک باتوں کی نشاندھی اور تبلیغ اسلام کے صحیح طریقہ کی وضاحت۔

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب صدیقی سندیلوی

(الفرقان لکھنو، مارچ ۱۹۹٦ع، جلد ٦۴، شمارہ ۳، ص ۳۲-۳۵)

مولانا محمد اسحاق سندیلوی کے حالات زندگی اور اُن کی حمیت اسلامی کا جائزہ۔

مختار احمد مکی

قدیم عربی لٹریچر میں کشمیر

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جنوری ۱۹۹٦ع، جلد ۱۵، شمارہ ۱، ص ۳۵-۴۰)

عرب سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں کشمیر کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے، اس میں اسی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری

ائمہ مساجد اور حکومت سے تنخواہ کی تحریک

(الفرقان لکھنو، نومبر ۱۹۹۵ ع، جلد ٦۳، شمارہ ۱۱، ص ۲۰-۲۵)

ائمہ مساجد کی تنخواہ کے مسئلہ کو

حکومت کے حوالے کرنے کو ایک قابل مذمت عمل قرار دیا ہے۔

نثار احمد فاروقی

مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ ایک مختصر تعارف

(الفرقان لکھنو، مارچ ۱۹۹۶ع، جلد ۶۴، شمارہ ۳۰، ص ۲۵۔۳۱)

مولوی محمد جعفر تھانیسری کے حالات زندگی اور اُن کی کتاب (کالا پانی) کا تعارف

ندوی احتشام حسین

عربی میں آزاد شاعری کا ارتقاء

(معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۶، شمارہ ۴، ص ۲۷۴۔۲۹۲)

عربی زبان کی آزاد شاعری کا تعارف اور اس کے تدریجی ارتقاء کی تفصیلات۔

نذیر حسین شیخ

مصر جدید کی دو اہل قلم خواتین

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۶ع جلد ۱۵۷، شمارہ ۱، ص ۵۷۔۶۳)

مصر جدید کی دو اہل قلم خواتین:

(۱) عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی اور (۲) زینب الغزالی کے حالات زندگی اور اُن کی دینی خدمات کا تذکرہ۔

ندوی جمشید

سرسید اور عربی زبان

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۹۵ ع، جلد ۱۴، شمارہ ۱۰ ص ۴۳۔۴۸)

سرسید کے تعلیمی حالات کی تفصیل اور ان کی عربی دانی کا جائزہ مختلف پہلوؤں سے

ندوی محمد اجتباء

عربی زبان کے ارتقاء میں حدیث نبوی کا حصہ

(معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۶، شمارہ ۳، ص ۱۸۶۔۲۰۲)

عربی زبان کی وسعت و ترقی میں احادیث نبوی کا جو حصہ ہے اس کی وضاحت مثالوں کے ساتھ۔

ادبیات

احمد سہیل

ادبی عمرانیات

(شب خون الہ آباد، دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۹، ص ۵۷-۶۳)

ادب کے عمرانیاتی نظریہ کی وضاحت اور اس کے مختلف اقسام کا بیان مثالوں کے ساتھ۔

اختر پرویز

حرانہ رحمت

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸-۱۵ جنوری ۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۲-۳ ص ۳، ۷، ۸)

شاہ بہاءالدین باجن برہانپوری کی حرانۂ رحمت پر ایک بحث دو قسطوں میں

آدم شیخ

عروج سلطانپوری کی غزل گوئی کے چند پہلو

(نوائے ادب بمبئی، عروج سلطانپوری نمبر، اکتوبر ۱۹۹۵ع، جلد ۴۵، شمارہ ۲، ص ۳۷-۵۶)

عروج کی غزل گوئی کا جائزہ مختلف پہلوؤں سے۔

اصلاحی، ضیاءالدین

سفرنامۂ روم و مصر و شام

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۶، شمارہ ۵-۶، ص ۳۴۵-۳۶۴، ۴۱۷-۴۳۶)

مولانا شبلی نعمانی کی کتاب ، سفرنامۂ روم و مصر و شام ، کا تحقیقی پس منظر، اور اس کا تفصیلی جائزہ۔ دو قسطوں میں

اکبر حیدری کشمیری

اقبال اور ندیم

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ فروری ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۷، ص ۱)

حکیم عبدالکریم ندیم کی صحافتی خدمات کا ذکر اور اقبال سے اُن کے تعلقات کی نشاندہی۔

تسلیم غوری بدایونی

اردوے معلیٰ اور قمر بدایونی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ فروری ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۶، ص ۳، ۷)

مولانا حسرت موہانی کی سیاسی و صحافتی خدمات کا ذکر اور قمر بدایونی کے اس انتخاب کی تفصیل جو حسرت کے اردوے معلیٰ کانپور میں شائع ہوئی۔

دیویندر اِسر

افسانہ : نئی صدی کی دہلیز پر

(آجکل نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۵ ع جلد ۵، شمارہ ۴، ص ۸-۱۳)

ماضی کے افسانوں کی روشنی میں مستقبل کے افسانوں کی ایک ادبی اور نئی تصویر۔

رضیہ حامد

زندہ رہنے والی آواز

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۴٦، ص ۸)

فضل دانش کی شاعری کا تذکرہ۔ وہ بھوپال کے رہنے والے تھے، ۱۰ نومبر ۱۹۹۵ ع کو انتقال فرمایا

سید داؤد اشرف

منشی پیارے لال شاکر
مدیر رسالہ العصر لکھنو اور حیدرآباد

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم ستمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۳۳، ص ۳)

منشی پیارے لال شاکر کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تذکرہ۔

شمیم حنفی

طرار دوام کا شاعر

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۱۱، ص ۲۵-۳۰)

طرار دوام کی غزلوں پر ایک نظر۔

صدیقی ظفر احمد

آبرو کا ایہام

(شب خون الہ آباد، نومبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۸، ص ۴۷-۵۴)

ولی اور آبرو کے درمیان مماثلت و مشابہت کی موجودگی کی نشاندھی اور آبرو کی ایہام گوئی کا جائزہ مثالوں کے ساتھ

طیب انصاری

شمس الامراء ثانی کی علمی و ادبی خدمات

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم فروری ۱۹۹٦ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۵، ص ۸)

حیدرآباد دکن میں اردو کو فروغ دینے والے نوابوں کا تذکرہ اور خاص طور پر شمس الامراء ثانی کی علمی ادبی خدمات کا جائزہ۔

عتیق اللہ

رشید احمد صدیقی اور اساسی جمالیات

(آجکل نئی دہلی، فروری ۱۹۹٦ع، جلد ۵۴، شمارہ ۷، ص ۱۴-۱٦)

رشید احمد صدیقی کے ادب وفن کا جائزہ اسلامی نقطۂ نظر سے۔

دسوی عبدالقوی

قصۂ ایوانِ ملا رموزی کا

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ ستمبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴ شمارہ ۳۴، ص ۱ اور ٦)

ملا رموزی کی ادبی تخلیقات کا ذکر اور اُن لوگوں کا جواب ہے جو ملا رموزی کو ایک ایسا نام سمجھتے ہیں جس کو کوئی نہیں جانتا

مجروح سلطانپوری کا شعری سفر اور ترقی پسند تحریک

(نوائے ادب بمبئی، مجروح سلطانپوری نمبر، اکتوبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۴۵، شمارہ ۲، ص ۲۲-۳٦)

مجروح کی غزلوں میں ترقی پسند عناصر کی نشاندھی اور اس سلسلہ میں پیدا شدہ اعتراضات، رد عمل اور شکایتوں کا جائزہ۔

آج مولانا ابوالکلام آزاد بہت یاد آتے ہیں

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ دسمبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۴٦، ص ۱ اور ۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی ادبی اور صحافتی خدمات کا ذکر۔

سرسید تحریک اور آج کے تقاضے

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۸، شمارہ ۱۱، ص ۳۷-٦۰)

۱۸۵۸ ع اور اس کے بعد سرسید کی کوششوں کے پس منظر میں ۱۹۴۷ ع اور اس کے بعد کے حالات کا جائزہ

علی سردار جعفری

اردو شاعری اور ہندوستان کی تہذیب

(شاعری بمبئی، جلد ٦٦، شمارہ ۷، ص ۱۳-۱۷)

ستیہ پال آنند کے ایک خط کا جواب، جس میں سردار جعفری نے سترہ اٹھارہ سال سے کوئی نئی تخلیق پیش نہ کرنے کی معذرت کی ہے۔ اور اپنے اُن سات مسودوں کا ذکر جو زیور طبع سے آراستہ ہونے کے منتظر ہیں۔

علیم صبا نویدی

محمد عبدالقادر شاکر وانمباڑی

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم نومبر ۱۹۹۵ ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۴۱، ص ۸)

وانمباڑی شمالی آرکاٹ کے ایک شاعر محمد عبدالقادر شاکر کی ادبی خدمات اور اُن کی تصانیف کا تعارف۔

قاضی جمال حسین

حمید احمد کی غزلیں

(شب خون الہ آباد، دسمبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۹، ص ۴۷-۵۲)

نئی شاعری میں حمید احمد کی شناخت اور اُن کے مخصوص طرزِ کلام کا جائزہ

قاضی عبیدالرحمن ہاشمی

اختر بستوی کی شاعری

(کتاب نما نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۱۰، ص ٦۸-۷۴)

اختر بستوی کی شاعری کا مختصر سا جائزہ۔

محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی۔ علی گڑھ میں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جنوری ۹٦ ع،
جلد ۱۵، شمارہ ۱، ص ۱۷-۲۵)

شبلی نعمانی ۱۸۸۳ ع سے ۱۸۹۸ ع تک پورے ۱٦ سال علی گڑھ میں مشرقی زبان کے ایک معلم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس درمیان میں انہوں نے جو علمی ادبی کام انجام دیے، ان کا تفصیلی جائزہ۔

محمد عمر

سرسید اور محمد عبدہ

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۹۵ ع،
جلد ۱۴، شمارہ ۱۰، ص ۲۹-۳۱)

سرسید اور محمد عبدہ کے افکار و تخیلات میں غیر اسلامی طریق فکر کے جو دھندلے نشانات ملتے ہیں، اُن کا تقابلی مطالعہ

مرزا اکبر علی بیگ

میر کاظم علی (برق موسوی) کے بارے میں

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸-۱۵ جنوری ۹٦ ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۲-۳، ص ۱-۲، ۳-٦)

برق موسوی، اُن کے خاندان اور ان کی تصانیف کا تذکرہ (پہلی قسط اور دوسری قسط)

معین الدین شاہین

رام لعل نابھوی۔ کچھ یادیں کچھ باتیں محمد جاوید سنبھلی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ ستمبر ۱۹۹۵ ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۳۴، ص ۳)

رام لعل نابھوی کے حالات زندگی
اور ان کے علمی ادبی کارناموں کا تذکرہ۔

مفتی محمد مشتاق تجاروی

غلام محمد۔ خواجہ میر درد کا ایک
غیر معروف مرید

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جنوری ۹۶ ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۱ ص ۳)

خواجہ میر درد صرف شاعر نہیں بلکہ
ایک سالک بھی تھے۔ جس طرح شاعری
میں ان کے بہت سے تلامذہ تھے،
راہ سلوک میں ان کے مرید بھی بہت
تھے جن میں غلام محمد بھی شامل ہیں،
اس میں ان کے حالات زندگی درج ہیں

نامی انصاری

رشید احمد صدیقی۔ ایک مطالعہ

(آجکل نئی دہلی، فروری ۱۹۹۶ ع، جلد
۵۴، شمارہ ۔، ص ۱۷۔۲۳)

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح پر
ایک تنقیدی نظر

مضطر سنبھلی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اکتوبر ۹۵ ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۴۰، ص ۲)

مضطر کی شاعری پر بحث

ویریندر پرشاد سکسینہ

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی۔ حیات
اور تصانیف

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اکتوبر ۱۹۹۵ ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۳۸، ص ۲، ۳، اور ۶)

عرش ملسیانی کی علمی ادبی خدمات
کا جائزہ۔

یوسف سرمست

عروج کی غزل۔ حالی سے رد تعمیر تک

(نوائے ادب بمبئی، عروج سلطانپوری نمبر،
اکتوبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۴۵، شمارہ ۲،
ص ۹۔۲۱)

عروج کی غزل گوئی کا جائزہ۔

(ایسی بلندی ایسی پستی) اور
حیدرآباد کی تہذیب

(سب رس حیدرآباد، دسمبر ۱۹۹۵ ع،

جلد ۵۷، شمارہ ۱۲، ص ۱٦ـ۱۹)

ایسی بلندی ایسی پستی اردو کے مشہور ناول نگار عزیز احمد کا مشہور ناول ہے۔ مقالہ نگار نے اس ناول میں موجود حیدر آبادی تہذیب کی نشاندہی کی ہے۔

مالک رام

ٹیپو سلطان شہید

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ فروری ۹٦ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۷، ص ۱)

مالک رام کا ایک پرانا مضمون جو الفضل ربوہ میں ۸ جون ۱۹۳۹ ع کو شائع ہوا تھا اس میں ٹیپو سلطان کے نام اور کام سے متعلق چند تاریخی حقائق درج ہیں۔

محمد نعمان

رتن سنگھ اور اُن کا فن

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۸، شمارہ ۱۱، ص ۷۳ـ۸۰)

رتن سنگھ کا تعارف اور ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ۔

مرزا خلیل احمد بیگ

اردو مراٹھی کا لسانیاتی رشتہ

(کتاب نما نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۸، شمارہ ۱۲، ص ۱۹ـ۲۲)

اردو اور مراٹھی کے رشتہ کا تاریخی پس منظر اور مراٹھی کے لسانی اثرات کا جائزہ۔

معین الدین عقیل

تنقیدات رنجور

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم نومبر ۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۴۱، ص ۱)

محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی (۱۸٦۳ـ۱۹۳۳ ع) کے حالات زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کا تذکرہ۔

سید حامد حسین

اردو رسم الخط کی اہمیت اور خصوصیت

(کتاب نما نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۱۰، ص ۱۱ـ۳۲)

اردو رسم الخط کی اہمیت پر ایک نظر۔

شخصیات

اصلاحی، ضیاء الدین

بدر الدین طیب جی

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹٦ ع،

جلد ۱۵۷، شمارہ ۲، ص ۱۴۹-۱۵۲) اور اُن کے کلام کا جائزہ۔

بدر الدین طیب جی کے حالات زندگی رشید الدین
اور ان کی وفات پر اظہار غم۔

احتر حسن مرحوم، صحافی، ادیب،
شاعر اور نقاد

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۹۶ع، جلد
۱۵۷، شمارہ ۲، ص ۱۵۲-۱۵۶)

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اکتوبر ۹۵ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۳۹، ص ۱-۲)

خواجہ احمد فاروقی کے حالات زندگی
اور ان کی وفات پر اظہار غم

احتر حسن مرحوم کے حالات زندگی
اور اُن کی گوناگوں ادبی خدمات کا جائزہ۔

بیدار عابد رضا

رفیعہ سلطانہ

قاضی رضا حسین

(ورودِ مسعود) پر ایک نظر

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۹۵ع،
جلد ۱۴، شمارہ ۱۲، ص ۱۵-۱۹)

(سب رس حیدر آباد، جولائی تا ستمبر
۱۹۹۵ع، جلد ۵۷، شمارہ ۷، ۸، ۹،
ص ۷۲-۷۶)

قاضی رضا حسین کے حالات زندگی
اور ان کے کارناموں کا ذکر، جو عام طور
پر اپنی تعلیمی خدمات کی وجہ سے بہار
کے سر سید کہلاتے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی خودنوشت
سوانح عمری کا تفصیلی جائزہ۔

عابدی سید امیر حسن

تسلیم غوری بدایونی

دیوانِ قصائد خاموش

مولانا حکیم انجم فوقی کی یاد میں

(معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۹۵ع، جلد
۱۵۶، شمارہ ۳، ص ۲۰۳-۲۱۴)

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اکتوبر ۹۵ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۳۹، ص ۸)

رائے صاحب رام متخلص بہ خاموش

حکیم انجم فوقی کے حالات زندگی کے حالات زندگی اور اُن کی منظومات

کا تعارف.

عبید اللہ

قاضی ارتضاء علی خان گوپاموی

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ۹۵ع، جلد ۱۵۶، شمارہ ۵، ص ۳۸۸-۳۹۱)

قاضی ارتضاء علی خان گوپاموی کے حالات زندگی اور ان کی عربی فارسی تصانیف کا تذکرہ.

عرفان احمد

پروفیسر سبرامنیم چندر شیکھر
ایک عظیم سائنس داں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۴، شمارہ ۱۲، ص ۲۶-۳۸)

سبرامنیم کے حالات زندگی اور ان کے سائنسی کارناموں کا تذکرہ

ندوی محمد اجتباء

مولانا سید جعفر علی نقوی

(البلاغ بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۵ع، جلد ۶، شمارہ ۳، ص ۴۸-۵۲)

مولانا نقوی کے حالات زندگی اور اُن کے دینی کارناموں کا تذکرہ.

دور جدید میں اسلامی بیداری
کے سرخیل
سید جمال الدین افغانی

(البلاغ بمبئی، نومبر ۱۹۹۵ع، جلد ۶، شمارہ ۴، ص ۲۶-۳۱)

سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی اور ان کی دینی خدمات کا ذکر.

شیخ محمـــد عبدہ

(البلاغ بمبئی، دسمبر ۱۹۹۵ع، جلد ۶، شمارہ ۵، ص ۲۱-۲۳)

شیخ محمد عبدہ کے حالات زندگی.

شیخ محمد رشید رضا

(البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۶ع، جلد ۶، شمارہ ۶، ص ۴۱-۴۲)

رشید رضا کے حالات زندگی.

متفرقــات

ادیب سید لطیف حسین

شہر دہلی کے تاریخی کتبات

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۶، شمارہ ۵-۶، ص ۳۶۵-۳۸۳،

والے ادب، عمیق

(۴۳۷ - ۴۴۹)

دہلی کی تاریخی اہمیت اور وہاں پائے جانے والے سنسکرت، عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے کتبوں کا تعارف، دو قسطوں میں

اصلاحی ضیاء الدین

کتب خانہ دار المصنفین کا ایک مخطوطہ - روضہ تاج محل

(معارف اعظم گڑھ، ۲ ستمبر ۱۹۹۵ ع،
جلد ۱۵٦ شمارہ ۳، ص ۲۱۵-۲۳۸)

دار المصنفین کے ایک مخطوطے روضہ تاج محل کا تفصیلی تعارف جس میں تاج محل کی عمارت سازی سے متعلق ساری تاریخی تفصیلات درج ہیں

عتیق احمد بستوی

متنی ال اور اسلامی تعلیمات

(الفرقان لکھنؤ، فروری مارچ ۱۹۹٦ ع،
جلد ٦۴، شمارہ ۲، ۳ ص ۴۹-٥٦)

مہاراشٹرا اسمبلی کا منظور کردہ متنی ال اور اس کا جائزہ، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

صدیقی محمد نجم الافاں

سلجوقی دور کا نامور قصیدہ گو شاعر ظہیر فاریابی

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹٦ ع،
جلد ۱۵۷، شمارہ ۲، ص ۱۳۰-۱۴۸)

ظہیر فاریابی کے حالات زندگی اور اس کی شعری صلاحیتوں کا جائزہ

فاروقی شمس الرحمٰن

نظم کا اسلوب

(شب خون الہ آباد، جنوری ۱۹۹٦ ع،
جلد ۲۹، شمارہ ۱۹۰، ص ۱۹-۲٥)

نظم کی تعریف اور اس کے اسلوب کا جائزہ مغربی ادب اور اس کے فن کی روشنی میں

مرزا اکبر علی بیگ

عامر موسوی مرحوم

(سب رس حیدر آباد، دسمبر ۱۹۹٥ ع،
جلد ٥۷، شمارہ ۱۲، ص ۳۴-۳٥)

عامر موسوی حیدر آباد کے مشہور ادیب اور شاعر تھے۔ اس مضمون میں اُن کے حالات زندگی درج ہیں۔

محمد صلاح الدین عمری

ترجمہ اور اس کے اصول دنیا آج

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۶ ع،
جلد ۱۵۷، شمارہ ۱، ص ۴۶-۵۹)

فن ترجمہ کی تعریف و تشریح اور
ان کے بنیادی اصولوں کی وضاحت۔

مومن عبدالرحمٰن

امریکہ میں طب اسلامی پر عالمی کانفرنس

(معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ ع،
جلد ۱۵۶، شمارہ ۴، ص ۲۹۳-۳۰۶)

فلوریڈا امریکہ کے ایک ادارہ
(انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک
میڈیسن) کا تعارف اور اس کے زیر اہتمام
۱۳-۱۶ اپریل ۱۹۹۵ع کو منعقد شدہ
طب اسلامی پر ایک عالمی کانفرنس کا
آنکھوں دیکھا حال۔

سید ساجد علی ٹونکی

ٹونک کے تعلیمی ادارے اور اردو

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر ۹۵ ع،
جلد ۵۴، شمارہ ۴۸، ص ۱-۲ اور ۶)

ٹونک کے چند مدرسوں، اسکولوں
اور کالجوں کا ذکر جہاں اردو بھی شامل
نصاب ہے۔

یعقوب یاور

ترجمہ کا فن اور مسائل

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم فروری ۹۶ ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۵، ص ۱-۲)

ترجمہ کے فن کی اہمیت پر زور اور
اس سے متعلقہ مسائل کا جائزہ

یوسف عامر

مصر میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جنوری ۹۶ ع،
جلد ۵۵، شمارہ ۱، ص ۸)

مصر میں اردو زبان کی تعلیم و تدریس
اور اردو کتابوں کے عربی تراجم کا تذکرہ۔

• • •

مودبانہ التماس

قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ اپنے

مضامین یا مقالے

نوائے ادب

میں بغرض اشاعت ارسال فرمائیں،

مدیروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے

رسائل و جرائد

مقالہ نما

میں شمولیت کی غرض سے بھیجیں،

ناشروں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی

تصانیف و تالیفات

کتابی دنیا

میں برائے تبصرہ ارسال کریں اور

اردو دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ اپنا

سالانہ چندہ

بھیجکر

نوائے ادب

کی سرپرستی قبول فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

مطبوعات و تالیفات

کتب	مصنف / مرتب
لغات گجری (مرتبہ) رقعات عالمگیر (مرتبہ) مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ) تاریخ ادب عربی (ترجمہ) برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ) سوراج (ترجمہ) رہنمائے صحت (ترجمہ) ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)	پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی
ولی گجراتی (مولفہ) نورالمعرفت (مرتبہ) غزل ولی تک (مولفہ) اردو ایسیز (مرتبہ)	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ) نوائے وقت (مولفہ) گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مصنفہ) طوطیان ہند (مرتبہ) انڈو ایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مصنفہ) انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ) مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
نوائے آزادی (مرتبہ) مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ) مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ) مبادیات تحقیق (مولفہ) راگ مالا (مولفہ)	جناب عبدالرزاق قریشی

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر حامد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

مقالہ نما مونہ محترمہ رقیہ انعامدار

نوائے ادب ، بمبئی

FORM : IV – ROLL NO : VIII

Registration No 32009/50 — رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	ششماہی
نام پرنٹر	جناب عبدالمجید پاڑکا، بی کام (آنرز)
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر قومیت پتہ	ایضاً
نام ایڈیٹر	پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ	ایضاً

میں عبدالمجید پاڑکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں

عبدالمجید پاڑکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof N. S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Mumbai-400 001

•

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs. fifty • Foreign . £ 10

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

•

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۴۶ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۹۶ ع

•

مندرجات

مودبانہ التمـاس

قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ اپنے

مضامین یا مقالے

نوائے ادب

میں بغرض اشاعت ارسال فرمائیں،

مدیروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے

رسائل و جرائد

مقـالہ نما

میں شمولیت کی غرض سے بھیجیں،

ناشروں سے اپیل ہے کہ وہ اپنی

تصانیف و تالیفات

کتـابی دنیا

میں برائے تبصرہ ارسال کریں اور

اردو دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ اپنا

سالانہ چنـدہ

بھیجکر

نوائے ادب

کی سرپرستی قبول فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں

نظـام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

احوال واقعی

انسٹی ٹیوٹ پچاسویں سال میں

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے اور آئندہ سال فروری ۱۹۹۷ء میں انجمن اسلام کے انسٹی ٹیوٹ کے قیام کو پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محترمی سیٹھ طیب جی کے دوران صدارت میں پروفیسر سید نجیب اشرف کی ڈائرکٹر شپ میں اس انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر ندوی صاحب کے انتقال پر ملال کے بعد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۱۹۶۹ء میں بحیثیت ڈائرکٹر مقرر کئے گئے لیکن صحت کی خرابی کی بنا پر مستعفی ہونے اور ۱۹۷۴ء میں پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کا یونیورسٹی کی منظوری سے اعزازی ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اول اس ادارے کے تحت ایم اے اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کے داخلے ۱۹۸۲ء تک باقاعدہ ہوتے رہے اور بعد میں صرف ڈاکٹریٹ کے لئے داخلہ دیا جانے لگا اور مقام مسرت ہے کہ اس وقت تک ۹ طلبہ نے اردو میں ڈاکٹریٹ بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کیا ہے اور اب تین طالب علم زیر تعلیم ہیں۔

اسی طرح ۱۹۵۰ء سے ایک تحقیقی جریدہ بنام "نوائے ادب" پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ پہلے مدیر پروفیسر ندوی تھے بعد میں ڈاکٹر مدنی رہے۔ ان کے بعد جناب عبدالرزاق قریشی اس جریدہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۷۶ء سے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر گوریکر مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ مجلہ پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے اور تحقیق و تنقید کے تعلق سے یہ جریدہ نہ صرف ہندوستان کے جامعات اور تعلیمی اداروں میں مقبول ہے بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

علاوہ ازیں اس ادارے کے زیر اہتمام وزارت وسائل ترقی انسانی، حکومت ہند (دہلی) کی سرپرستی میں اردو خطاطی کا مرکز ۱۹۷۴ء میں قائم ہوا جو آج بھی ہے اور جہاں طلبا اور طالبات خطاطی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنا روزگار حاصل کر رہے ہیں اور کچھ طلبہ سعودی عرب،

ایران، عراق جیسے ممالک میں خطاطی کا کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی ذاتی دلچسپی۔

یہ لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ انجمن اسلام (بمبئی) کے صدور حضرات میں بالخصوص بیرسٹر پیر بھائی، بیرسٹر عبدالرحمن انتولے اور جناب معین الدین حارث نے انسٹی ٹیوٹ کے فروغ کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کی اور اب ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب جو کوئی دس بارہ سال سے اس عہدہ پر فائز ہیں اپنے ذوق و شوق کی بنا پر انسٹی ٹیوٹ کے کاموں میں نہ صرف دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اس کے معاملات کو آگے بڑھانے کے لئے دامے، درمے، سخنے اور قلمے تعاون دیتے رہے ہیں اور انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال ایک دو سیمینار اور تقاریر منعقد کرنے میں مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب جیسے فعال صدر کی زیر نگرانی میں یہ انسٹی ٹیوٹ ترقی کے مدارج طے کرتا رہیگا۔

سال آئندہ انسٹی ٹیوٹ کا ((جشن زریں)) منانے کا پروگرام مرتب کیا جائیگا اور ((نوائے ادب)) کا خصوصی شمارہ بھی قارئین حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کا اہتمام کیا جائیگا۔ اردو دوستوں، قلمکاروں اور دانشوروں سے توقع ہے کہ وہ اپنا پیام بھیجکر ادارے کی سرپرستی قبول فرمائیں گے اور ((جشن زریں)) کو کامیاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔

بین الاقوامی مذاکرہ میں ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی شمولیت۔

خوشی کی بات ہے کہ دہلی میں منعقدہ ستمبر ۱۹۹۶ ع میں بین الاقوامی مذاکرہ میں ہماری انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور ان سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ بھی ((ہندوستان میں اقلیتیں)) کے تعلق سے اپنے زریں خیالات کا اظہار کریں۔ اس کانفرنس میں سارے ہندوستان کے مختلف حلقوں سے خواتین و حضرات تشریف فرما ہوئے بلکہ بیرونی ممالک کے بھی نمائندے شریک مذاکرہ تھے۔ سابق وزیر ہند محترم کرن سنگھ صاحب جیسے لائق اور فاضل صدر نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کے افکار و خیالات

پر نہ صرف روشنی ڈالی بلکہ انکے خیالات سے متفق ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔

اس مذاکرہ میں ہندوستانی مندوبین کے علاوہ امریکہ، فرانس، بنگلہ دیش، نیویارک کے نمائندے بھی خصوصی طور پر شریک تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو انکے مقالہ پر مبارکباد پیش کی۔

انجمن اسلام میں یوم اساتذہ

انجمن اسلام کے زیر اہتمام اداروں کے اساتذۂ کرام کو صدر انجمن اسلام ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب نے سال رواں کے (یوم اساتذہ) میں دعوت ظہرانہ میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ڈاکٹر صاحب کی آواز پر لبیک کہکر تقریباً آٹھ سو سے زائد اساتذۂ کرام نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنی یک جہتی کا اچھا مظاہرہ کیا اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اچھے معلم یا معلمہ ہونے کا خاصہ ثبوت دیا

ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ انشاءاللہ آئندہ سال سے اچھے معلموں کو نشانِ امتیاز بھی دینے کا اہتمام کیا جائیگا۔

علیگڑھ یونیورسٹی کی پہلی خاتون پروکٹر

علیگڑھ یونیورسٹی کی مجلس عاملہ نے محترمہ ڈاکٹر نوشاد زاہو صاحبہ کو پروکٹر کے عہدہ پر مامور کیا ہے اگرچہ یہ خاتون یونیورسٹی میں شعبۂ سماجیات کی صدر رہ چکی ہیں اور ایک باوقار پروفیسر اور دانشور ہیں ہم انکی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس عہدہ پر رہکر یونیورسٹی کے نظام میں ہر ممکن تعاون فرمائینگی اور اپنے قابل قدر تجربات کی روشنی میں دیگر مسلم تعلیم اداروں کی بھی رہنمائی کرتی رہینگی۔

شہر بمبئی اور اسکے مضافات سے ادبی جریدوں کا اجراء

یہ ایک لائق تحسین عمل ہے کہ بمبئی اور اسکے مضافات جیسے تجارتی اور بین الاقوامی شہروں سے اردو کے ادبی جریدے نکل رہے ہیں سہ ماہی (ترسیل) کوکن اردو رائٹرز گلڈ کی پیشکش ہے جو ڈاکٹر یونس اگاسکر کی ادارت میں

شائع ہوتا ہے اور شرف کمال صاحب اور انجم عباسی صاحب معاونین کی حیثیت سے مدیر "ترسیل" کا تعاون فرماتے ہیں اگرچہ یہ کوکن کا ترجمان ہے لیکن شائع ہوتا ہے بمبئی سے اس جریدے کے توسط سے اردو ادیبوں، اردو دانشوروں اور اردو قلمکاروں سے رابطہ قائم کرنیکا اچھا موقع ملتا رہیگا

اسی طرح بھیونڈی سے ایک سہ ماہی "تکمیل" پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ یہ بھی ایک تحقیقی اور تنقیدی مجلہ ہے جو جناب اصغر حسین قریشی اور جناب مظہر سلیم کی ادارت میں شائع ہورہا ہے دراصل یہ ایک قابل تعریف ادبی خدمت ہے۔ توقع ہے کہ یہ رسالہ بھی ادبی دنیا میں کافی مقبول ہوگا۔

"تکلم" یہ ایک ماہنامہ ہے جو پونہ سے شائع ہوتا ہے اس کے نگراں ڈاکٹر امامہ شمع ہیں اور مدیر حکیم رازی امید کیجاتی ہے کہ یہ "ماہنامہ" دن پر دن ترقی کرتا رہیگا

یہ بیرون ادبی جریدے ایسے ایسے حلقوں کی اردو کے تعلق سے جو کچھ کام ہورہا ہے اس کے بارے میں نہ صرف وضاحت سے لکھینگے بلکہ ایسے حلقوں کے ادیبوں اور شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کے بارے میں بھی لکھتے رہینگے تاکہ عصری تقاضوں، ہنگامی قدروں اور انسانی ضرورتوں کی نشاندہی ہوتی رہیگی۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی رحلت

افسوس کی بات ہے کہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈائرکٹر جامعہ ملیہ شعبۂ اسلامیات (دہلی) اللہ کو پیارے ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے ہماری انجمن کی دعوت پر ۱۹۸۲ع میں معین الدین حارث میموریل سیرت پر دو لکچر دئیے تھے جو بہت پسند کئے گئے۔ آپ اردو انسٹی ٹیوٹ کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اور اسکے مجلہ "نوائے ادب" کو بہت پسند کیا کرتے تھے

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں بلند سے بلند جگہ عطا کرے۔ آمین!

نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

‹آزادیات› کا مطالعہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

از

ڈاکٹر گیان چند جین، اندر نگر، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶

(۲)

۵ ارمغان آزاد (جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن پر مقالے)

حکومت ہند کے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ۱۹۷۴ع سے مددی غالب انعام برائے شاعری دینا شروع کیا ۱۹۸۶ع کا انعام جگن ناتھ آزاد کو ملا ان سے پہلے یہ انعام بالترتیب ان شعرا کو ملا

جمیل مظہری، جذبی، وجد، بسمل سعیدی (بعد از مرگ)، خلیل الرحمن اعظمی، مجروح، فراق، ناداں، ساحر لدھیانوی (بعد از مرگ)، نارش پرتاپ گڑھی (بعد از مرگ)، میکش اکبر آبادی، اختر انصاری اور ان کے بعد کے تین سالوں میں سردار جعفری، اختر الایمان اور کیفی اعظمی کو ملا اس فہرست سے ظاہر ہے کہ تاریخی ترتیب شاعروں کے درجے کے مطابق نہیں میرا کہنا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کو یہ انعام ۱۹۸۶ع سے پہلے ہی ملنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے پیش روؤں میں بعض سے بہتر شاعر ہیں آزاد کو انعام ملنے پر جموں کے کئی اداروں نے مل کر جموں یونیورسٹی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۸۷ع کو ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا۔ اسی کے مضامین کو ڈاکٹر ظہور الدین، ریڈر شعبۂ اردو نے مرتب کیا اب ظہور الدین پروفیسر و صدر شعبہ ہیں ظہور الدین کے دیباچے بہ عنوان ‹تقریب اشاعت› پر ۱۵ جنوری ۱۹۸۸ع کی تاریخ پڑی ہے لیکن یہ دیدہ زیب مجموعہ مجروم لٹریری سوسائٹی دہلی کی طرف سے ۱۹۹۳ع میں اشاعت پذیر ہوسکا مجھے اس مجموعے سے خصوصی دلی تعلق ہے کیونکہ اس کے لکھنے والوں میں کئی میرے شاگرد یا رفیق کار ہیں، دوسرے کئی مضمون نگاروں سے میں قیام جموں کے زمانے سے واقف ہوں۔

مجموعے میں ۲۵ مضامین ہیں جن میں غلام رضوی گردش کے مضمون کے

علاوہ بقیہ سب ریاست جموں و کشمیر کے ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں ان میں چھپے مضامین پہلے کے مجموعوں میں بھی ملتے ہیں بقیہ ۱۹ نئے ہیں۔ چند مضامین انگریزی یا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں حسب معمول میں بعض مضامین کے قابل ذکر نکات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

سب سے زیادہ معلومات افروز محمد اسداللہ وانی کا مضمون "جگن ناتھ آزاد ماہ و سال کے آئینے میں" ہے۔ دراصل یہ مضمون نہیں، ایک قسم کی توقیت ہے "لمحے لمحے"، بدایوں میں وانی کی مرتبہ توقیت ۲۳ صفحوں کی تھی اب وہی اضافوں کے ساتھ ۴۶ صفحوں پر آئی ہے اس میں آزاد کی چار کتابیں زیر طباعت دکھائی ہیں میری معلومات کے مطابق یہ ابھی شائع نہیں ہوئیں آزاد کے بارے میں کتابوں کی تعداد اس بار ۱۳ ہوگئی ہے اس میں رسالوں کے گوشے بھی شامل ہیں ان کے علاوہ حسب ذیل عنوانات کی تفصیلات ہیں

۵۵ توسیعی خطبات، ۱۸۵ دوسرے مقالات، بیرونی ممالک میں ۲۷ براڈکاسٹ اور ٹیلی کاسٹ پروگرام، ۵۳ انجمنوں کی رکنیت، ۹۷ انعامات و اعزازات

اسداللہ وانی آزاد کے ناسوبل ہیں آزاد نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بارے میں جملہ مواد مثلاً خطبات، مضامین، تقریبات کے دعوت نامے وغیرہ وانی کو دے دیتے ہیں اس خام مواد کی بنا پر وانی آزاد کے بارے میں جامع معلومات مرتب کرکے پیش کرتے ہیں

مجموعے کا سب سے طویل اور پرمغز مضمون "پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی فلسفیانہ بصیرت"، خود مرتب مجموعہ ڈاکٹر ظہور الدین کے قلم سے ہے۔ یہ ص ۷۷ سے ص ۱۰۸ تک یعنی ۳۲ صفحوں کو محیط ہے اس کے دو حصے ہیں شاعری، اقبالیات مضمون نگار نے آزاد کی شاعری میں غوطہ لگا کر، کھنگال کر کہاں کہاں سے مفکرانہ اشعار اور بیانات تلاش کیے۔ لگتا تھا مضمون انہیں پر ختم ہوجائے گا لیکن اس کے آگے اقبالیات کے سلسلے میں آزاد کی خالص فلسفیانہ اور مفکرانہ نگارشات کی وہ ریل پیل ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مفکر

آزاد شاعری میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالیات کی نثر میں۔ بہرحال مضمون خوب سے خوب تر ہے۔

غلام گردش صاحب کے ہندی مضمون (جگن ناتھ آزاد کشمیر میں) کو ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مضمون شخصی واقعات و لطائف پر مشتمل ہے، اسی لیے نہایت دلچسپ ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں (انگریزی، فارسی، عربی، اردو، ہندی اور پنجابی ایک ساتھ لکھنے اور بولنے والی شخصیت کا نام ہے جگن ناتھ آزاد) (ص ۱۴۷)

مجھے شک ہے کہ آزاد ان سب زبانوں میں لکھ اور بول سکتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ وہ عربی آشنا بھی ہیں۔ منظــــر اعظمی کا لکھے لکھے والا مضمون یہاں بھی شامل ہے۔ اس کے قابلِ قدر ہونے میں کلام نہیں۔ تہمینہ اختر کے دو مضمون ہیں۔ ایک سابقہ مجموعے سے لیا ہے، دوسرا نیا ہے (جگن ناتھ آزاد کی تنقید نگاری نشانِ منزل کی روشنی میں)۔ نشان منزل میں شامــــل مضامین کا تہمینہ نے خوبی کے ساتھ تعارف پیش کیا ہے۔ آزاد کو اتنے اعزازات و انعامات ملے ہیں کہ آخر الذکر ڈاکٹر خورشید حمرا صدیقی کے مضمون کا موضوع ہو گئے۔ اس کا عنوان ہے (جگن ناتھ : انعامات و اعزازات کی روشنی میں۔)

اس کے آگے جو دیے ہیں تین انٹرویو ہیں، پہلا راج کمار چندن کا ہے جو العطش میں آچکا ہے۔ دوسرا صوفی غلام محمد ایڈیٹر سری نگر ٹائمز کا (جگن ناتھ آزاد کا سفرِ پاکستان) کے عنوان سے ہے جس میں آزاد نے منجملہ دوسرے سفروں کے تقسیم کے بعد پاکستان چھوڑنے کی دلچسپ شخصی روداد سنائی ہے۔ آخری اور سب سے طویل انٹرویو ڈاکٹر ضیاء الدین کا ہے (جگن ناتھ آزاد سے تین ملاقاتیں) جو ص ۲۶۳ سے ۳۱۱ تک پھیلا ہوا ہے اس سے آزاد کی شخصیت بہت عمدگی سے کھل کر سامنے آتی ہے اس میں اتنی دلچسپ معلومات، آزاد کے اتنے اہم نظریات و خیالات بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کی فراوانی کا میں حریف نہیں ہوسکتا، سکوت اختیار کرتا ہوں۔ مجھے تنقیدی مضامین کے مقابلے میں غلام گردش رضوی کا مضمون اور یہ تینوں انٹرویو زیادہ دلچسپ معلوم ہوئے۔

جموں کے شعبۂ اردو کی تاسیس میں نے کی تھی، اسے بام عروج پر پہنچایا آزاد صاحب نے۔ اس شعبے نے ان کے متعلق اتنی اچھی کتاب تیار کی ہے، اسے دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔

۶　سلسلۂ آزادیات کی چھوٹی کتاب جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات) جلد اول خلیق انجم نے ترتیب دی ہے۔ یہ رسالوں کے سائز کی بھاری بھر کم کتاب ہے۔ جسے محروم لٹریری سوسائٹی نئی دہلی نے ۱۹۹۳ع میں شائع کیا خلیق انجم کو توقع ہے کہ بہت جلد مزید مضامین مل جائیں گے جنھیں وہ مرتب کر کے دوسری جلد شائع کردیں گے۔ اس مجموعے میں چھوٹے بڑے ۳۱ مضامین، آزاد کے چار لیکچر، مختصرات کا ایک طویل سلسلہ اور آزاد کی تصویروں کا البم ہے اس میں اور پرانے مجموعوں میں صرف دو چیزیں مشترک ہیں افسانہ نما نثر، اور خواجہ احمد عباس کا مضمون۔

خلیق انجم نے حرف آغاز میں آزاد کے ترانۂ پاکستان کے چار بند نقل کیے ہیں اس کا ایک مصرع ہے ع

تندی حاسداں پہ ہے غالب ترا سواک

میں لفظ سواک سے آشنا نہ تھا لغت میں دیکھا تو اس عربی لفظ کے معنی ہیں (دانتوں قدم) معنی کے لحاظ سے شعر میں یہ لفظ برجستہ ہے لیکن اجنبی ہے۔ ترانے کے بعد مرتب نے آزاد کی نظم (بھارت کے مسلمان) کی بہت داد دی ہے اور اس کے ساتھ ہی آزاد کی دو مشہور ترین غزلوں کے اشعار درج کیے ہیں: (بیگانوں نہ کیا گزری) اور (سوز پنہاں لے کے آیا ہوں) گویا انھوں نے دیباچے میں آزاد کی چار مشہور ترین مختصر نظموں کو سمو لیا ہے مجموعے کے متن کے حسب ذیل حصے ہیں:

شخصیت۔ شعریات۔ اقبالیات۔ نثریات۔ منظومات نہیں مقام کی جوگر طبیعت آزاد (یعنی باہر کے ملکوں میں آزاد)۔ میانوالی میں واپسی۔ مختصرات۔ انٹرویو۔ تصاویر

میں بعض مضامین کے قابلِ ذکر نکات کا تعارف پیش کرتا ہوں

شخصیت کے جزو میں چھ مضامین ہیں جن میں دو پاکستانی ادیبوں کے اور ایک بنگلہ دیشی ادیب کا ہے۔ سب رس کراچی میں سے خواجہ حمید الدین شاہد کا مضمون (ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد) ڈائجسٹ کیا ہے جس میں وہ آزاد کے دو امتیازات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اول یہ کہ کشمیر یونیورسٹی انہیں ۱۹۸۹ء کے کانووکیشن میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے گی۔ دوسرے یہ کہ جموں یونیورسٹی نے ان کی ایمریٹس شپ میں تاحیات اعزازیے کے ساتھ توسیع کی ہے واقعی یہ دونوں بڑے اعزاز ہیں

سید ضمیر جعفری کی تحریر (جگن ناتھ آزاد کا ہمتہ) کے اوپر قوسین میں (وادل رنگ) لکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ ص ۳۵ پر رسالہ کتاب نما، دہلی اکتوبر ۹۱ء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو

(بک سینٹر، بریڈفورڈ، یہ برطانیہ کی اردو کتابوں کی دکان کا نام ہے یہ دکان تین منزلوں پر محیط ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا کہنا ہے کہ میں نے زندگی میں اردو کتابوں کی اتنی بڑی دکان ہندوستان میں دیکھی ہے نہ پاکستان میں اور نہ کسی اور ملک میں)

کتنی خوشگوار حیرت کا مقام ہے!

مجموعے کا دوسرا جزو تعریفات ہے جس میں آزاد کے شعری مجموعوں اور شاعری پر ۱۱ مضامین یا مختصر تحریریں ہیں۔ ان میں کئی قلم کار پاکستان کے ہیں۔ پشاور کے ایوب صابر کے مضمون کا عنوان ہے (کیا پاکستان کے پہلے ترانے کے خالق جگن ناتھ آزاد تھے) عنوان سے توقع ہوتی ہے کہ اس سوال پر کوئی تحقیقی بحث ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ مضمون کے دوران یہ بات محض اطلاع کے طور پر درج ہے بقیہ دوسرے ہی موضوعات ہیں۔ مضمون نگار آزاد کے اس خیال سے متفق نہیں کہ اقبال نے اپنی نظم (ساقی نامہ کاشمیری) میں نہرو خاندان کی مدح کی ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں خود پنڈت جواہر لال نہرو

کو بھی یہ خوش فہمی تھی (ص ۵۰)

حامد برگوش (مشفق خواجہ) نے آزاد کے نئے مجموعے (نوائے زمیدہ) کے بارے میں تکبیر کراچی میں ایک مزاحیہ کالم لکھا ہے جسے اس مجموعے میں ڈائجسٹ کرلیا گیا ہے مختصر سا مضمون ہے بہت دلچسپ اس مجموعے میں بیشتر مضامین مختصر ہی ہیں لیکن شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی کے ڈاکٹر وحید دیو سنگھ کا مضمون (جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر ایک نظر) سب سے طویل یعنی ۲۴ صفحوں کا ہے صرف مفصل ہی نہیں بلکہ پورے غور اور عمیق نظر کے ساتھ لکھا گیا ہے اس کے بعد ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا ۲۱ صفحوں کا مضمون (جگن ناتھ آزاد) ہے یہ صاحب میانوالی پاکستان کے علاقے کے ہیں اور آزاد کا ذکر کئی بار (جگن صاحب) کہہ کر کرتے ہیں مضمون کے بیشتر آزاد کا عنصر بابوڈیٹا یا توقیت بھی ہے اور عارفانہ نقد بھی

کتاب کا تیسرا حصہ (اقبالیات) ہے اس میں اول اقبال نمائش (ص ۱۱۹ تا ۱۲۴) کی وہی تفصیل ہے جو لمحے لمحے کے خاص نمبر میں ہے اس کے بعد دوسروں کے چند مضامین اور آزاد کے چند لیکچر ہیں صباح الدین عبدالرحمن نے دوسری بین الاقوامی اقبال کانگریس لاہور پر معارف دسمبر ۸۳ ع میں شذرات لکھے اس کے آخری جملے قابل ملاحظہ ہیں

(ہم ہندوستانی نمائندوں کو خوشی اور حیرت ہوئی جب اُن (جاوید اقبال) کی زبان سے یہ سنا کہ ہندوستان میں علامہ اقبال پر پاکستان سے زیادہ کام ہوا ہے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صدارتی تقریر سن کر ایک بزرگ نے کہا کہ اس کام نے تو سب کو پچھاڑ دیا) (مجموعہ ص ۱۸۹)

یہی بات جاوید اقبال صاحب کا حسنِ اخلاق ہے ورنہ مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ اقبال پر ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ کام ہوا۔ مسعود خالد (لاہور) نے آزاد کی کتاب (اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ) پر لکھتے ہوئے پاکستان کے نام نہاد ماہرینِ اقبال کی خبر لی ہے۔

"ہمارے ہاں اقبالیات سے متعلق سرکاری اداروں پر ایسے لوگوں کو اجارہ داری حاصل ہو گئی ہے جو اپنی تربیت، دہانت اور افتادِ طبع کی بنا پر فکرِ اقبال کی گہرائیوں میں اترنے کے نااہل ہیں، لہٰذا وہ جذباتی نعرہ بازی پر تکیہ کرتے ہیں۔ انہوں نے دس بارہ گھسے پٹے جملے رٹ رکھے ہیں جنہیں وہ آنکھوں میں آنسو لاکر ہر جگہ دہراتے رہتے ہیں۔ اقبال کے یہ مجاور نہ تو کچھ کرنے کے اہل ہیں اور نہ ہی دوسروں کو کام کرنے کا موقع دینے پر آمادہ ہیں کہ اس طرح ان کی ناجائز اجارہ داری کو ضعف پہنچ سکتا ہے" (ص ۱۸۲)

ص ۱۸۸ کے ایک فٹ نوٹ میں مرتب نے العطش جموں کے آزاد نمبر کو محمد ایوب واقف کی مرتبہ مجموعے پر تاریخی اعتبار سے مقدم قرار دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ واقف کی کتاب ۱۹۸۰ ع میں شائع ہوئی اور العطش کا نمبر ۱۹۸۶ ع میں۔

مجموعے میں نثریات کے کمزور جزو کے بعد منظومات ہیں جن میں کئی شعرا کی آزاد پر نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اگلے جزو کا عنوان آزاد کا ایک شعر ہے ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

آزاد جہاں گرد آدمی ہیں جتنی بار انہوں نے جتنے زیادہ بیرونی ممالک کا سفر کیا ہے، وہاں کلام سنایا ہے، لیکچر دیے ہیں، اردو والوں میں ان کا ہمسر نہیں دکھائی دیتا۔ اس جزو میں آزاد کے بیرونی ممالک کے بعض سفروں ہی کا بیان ہے۔ اگلا جزو بھی ایک شعری عنوان رکھتا ہے ؎

درد ہو دل میں تو درد آگاہ دیوانے بہت شمع کو جلنے کا ڈھنگ آئے تو پروانے بہت

اس میں آزاد کے وطنِ مالوف عیسیٰ خیل و میانوالی کے سفر کے جذباتی مرقعے ہیں۔ عنوان کا شعر موضوع سے زیادہ چسپاں نہیں۔ اگلے جزو کا عنوان "مختصرات" ہے جو مختصر متفرقات پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو سینار لندن میں آزاد نے جوش کے بارے میں ایک تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ جوش صاحب صرف لکھنؤ کی اردو کو معیاری اردو مانتے تھے، دہلی کی اردو کو وہ غیر معیاری کہتے

تھے ۔ پنڈت کیفی نے ایک دفعہ ایک مقالہ آج کل میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ جوش نے اس میں اتنی ترمیم و اصلاح کردی کہ "اگر وہ ایسے ہی چھپ جاتا تو عرش اور آزاد، کیفی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہتے" آخر بڑی مشکل سے جوش صاحب کو مقالہ اصل صورت میں چھاپنے کے لیے راضی کیا۔ (ص ۲۷۲)

ترقی اردو بورڈ کراچی میں ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب منتخب الحکایات شاہد احمد دہلوی کے مقدمے کے ساتھ اشاعت کے لیے آئی جوش ایسے بر پھرے تھے کہ انہوں نے مقدمہ اور اصل کتاب میں ان کے نزدیک جو لسانی خامیاں تھیں ان پر خط کھینچ دیے نذیر احمد، کیفی اور شاہد احمد دہلوی کی زبان کو غلط قرار دینے والا شخص بزعم خود غلط قرار پائے گا شاہد احمد نے جوش کی لکھنوی زبان پر طنز کیا۔

"لکھنؤ میں پڑی ہے پوربی زبان ذات ہونٹیں کا کہت ہو، ہمار کے ہاں جنی بولت ہیں"

یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی اردو اودھی زدہ ہے دوسری بات یہ ہے کہ کیا ایڈیٹر کو کسی مضمون کی زبان یا مطالب میں ترمیم کا حق ہے میرے خیال میں، نہیں اس میں ذرا سی بھی ترمیم تحریف کے ذیل میں آئے گی۔ اگر مدیر مضمون کے کسی پہلو سے غیر مطمئن ہے تو مضمون مقالہ نگار کو واپس کرکے اپنے اعتراض اس تک پہنچا دے۔

مجموعے میں برمنگھم کے سعید اختر درانی کا مضمون ہے جس میں یہ دلچسپ اطلاع دی ہے کہ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات میں سوچترا (کذا، صحیح سُچترا) کرپلانی نے اقبال کا ترانۂ ہندی گایا ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا (ص ۲۸۳)

اگلے حصے میں اسد اللہ واسی کا آزاد صاحب سے ایک طویل انٹرویو ہے ۲۸ صفحوں کا۔ اس میں قابل ذکر نکتوں کی بھرمار ہے۔ میں صرف دو چار ہی

پیش کرسکوں گا۔

وانی نے سوال کیا کہ وہ ہندوستان اور باہر کی یونیورسٹیوں میں اردو کی رفتار اور ترقی سے کس حد تک مطمئن ہیں اس پر آزاد نے جواب دیا:

«ہندوستان سے باہر اردو کے لیے جو کام ہورہا اس سے تو میں مطمئن ہوں لیکن ہندوستان کے اندر جو کچھ ہورہا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ حسد کا جذبہ ہے۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جارہا ہے۔ اکیڈمیاں بڑی حد تک جوڑ توڑ اور سازشوں کے مراکز بن گئیں اور ان کے اکثر کارپرداز اپنے بھائی بندوں کو فیض پہنچانے کے کام میں مصروف ہوگئے» (ص ۳۰۶)

بعض دوسرے سوالوں کے جوابات

«مشاعرہ۔ ملک کے طول و عرض میں ایک تجارتی ادارہ بن کے رہ گیا ہے مشاعروں کے اکثر و بیشتر منتظمین یا تو روپیہ کمانے کے لیے مشاعرے منعقد کراتے رہتے ہیں اور یا حکومت کے وزرا، بڑے افسروں، مختلف ملکوں کے سفراء اور سفارت خانوں کے افسر حضرات سے اپنے مراسم بڑھانے کے لیے۔

اردو کے اکثر سیدھے سادے حامی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فلم نے اردو کو بہت فائدہ پہنچایا ہے حالاں کہ فلم ایک صنعت ہے۔ فلمی صنعت کاروں نے اردو کو اپنے مفاد اور حصول زر کے لیے استعمال کیا ہے، اردو سے انھوں نے کروڑوں اربوں روپے کمائے ہیں اور اس کے بدلے میں انھوں نے ملک کو دیا کیا ہے؟ اردو شاعری کے بدترین نمونے فلمی شاعری کی بدمذاقی براہ راست مشاعروں تک پہنچی یعنی مشاعروں کے ہزاروں لاکھوں سامعین تک،» (ص ۳۰۷)

جنوں یونیورسٹی میں خود کے پروفیسر مقرر ہونے پر کہتے ہیں

«صرف دو اشخاص کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ انھیں میرا یہ تقرر ناگوار گزرا تھا اور انھوں نے یہ فیصلہ رکوانے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ ظاہر

ہے کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی تھی ' (ص ۳۱۲)

'فلسفے سے بیگانہ ہوکر کوئی شاعر بڑا شاعر نہیں ہوسکتا۔ بڑے شاعر کے معنی ہی یہ ہیں کہ شاعر فلسفی شاعر ہے۔ . اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اردو میں بڑے شاعر صرف تین ہیں، میر، غالب اور اقبال ان کے بعد آتے ہیں اچھے یا بہت اچھے شاعر مثلاً نظیر اکبر آبادی ' (ص ۱۸-۳۱۷)

اس مقولے میں 'مثلاً' کے بعد آزاد نے ۲۲ شاعروں کے نام لیے ہیں جن میں زیادہ تر ہمارے ہم عصر ہیں مثلاً ندیم، قتیل شفائی، احمد فراز، وجد وغیرہ حیرت ہے کہ ان میں انیس کا نام غائب ہے

وانی نے پوچھا کہ انھیں تک انھیں پدم شری یا پدم بھوشن کا ایوارڈ کیوں نہیں ملا۔ اس کے جواب میں آزاد نے چار سوا چار صفحوں پر راز درونِ پردہ افشا کیا کہ کئی سال تک جموں کشمیر کے گورنر اور وزیر اعلیٰ ان کا نام پدم شری کے لیے بھیجتے رہے لیکن انھیں یہ خطاب نہ ملا (ص ۳۰-۳۲۵)

انٹرویو کے بعد کتاب کے آخر میں ۸۰ صفحوں پر مشتمل آزاد صاحب کی تصویریں ہیں یا ان کی تحریروں کے عکس ہیں اور یہ جزو نہایت دلچسپ ہے۔

۷ آزادیات کی آخری کتاب رسالہ کتاب نما دہلی کا خصوصی شمارہ 'پروفیسر جگن ناتھ آزاد (شخصیت اور ادبی خدمات)' اپریل ۱۹۹۴ع ہے جسے ایم حبیب خاں نے مرتب کیا کتاب نما کی روایت کے مطابق یہ خوبصورت رسالہ محض ۹۵ صفحات کا ہے اس کے پانچ مضامین پہلے کے مجموعوں میں آچکے ہیں ان میں شامل ہے اسد اللہ وانی کا 'توقیت پروفیسر جگن ناتھ آزاد' جو ان کی پہلی توقیت کا اختصار ہے ناواقفیت کے سبب مرتب نے وانی کا نام محمد اسعد اللہ لکھا ہے حالانکہ صحیح نام محمد اسد اللہ ہے میرے اس شاگرد نے میرے زمانے میں جموں سے ایم اے کیا تھا

اداریے میں ایم حبیب خاں لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۸ع سے ۱۹۵۵ع کے زمانے

میں اقبال کا نام لینا جرم سمجھا جاتا تھا۔ چوری چھپے ہی لوگ اقبال کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے، (ص ٦) میں اس کی مفصل تردید پیچھے «لمحے لمحے» کے سلسلے میں کرچکا ہوں۔ تقسیم ملک کے بعد بھی ملک میں اقبال اسی طرح مقبول رہے جیسے پہلے تھے۔ ان پر کتابیں، مضامین اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے رہے۔ حبیب خاں یہ دلچسپ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ جب آزاد کی کتاب «اقبال اور اس کا عہد» چھپ کر آئی تو دلی میں سی آئی ڈی کا ایک آدمی ان ان کا پیچھا کرتا تھا۔

مسعود حسین خاں کے مضمون کا عنوان ہے «یہ عجب مجموعۂ اضداد اے آزاد تو»۔ اس میں انہوں نے بے ضرورت اور بے موقع اسلوب احمد انصاری پر چھینٹے اڑانے کا بہانہ نکال لیا۔ لکھتے ہیں۔

«آزاد کے مجموعۂ اضداد ہونے کا ایک اور ثبوت ان کی علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت ہے۔ اقبال پرست تو اور بھی ہیں (بعض اوقات اسلوب احمد انصاری کی طرح نفیر سمجھے ہوئے) لیکن آزاد کی اقبال پرستی کے سرچشمے زیادہ گہرے ہیں۔۔۔ اقبال سے ان کی اس عقیدت کے پیشِ نظر پاکستان کے ایک سفر میں ان سے یہ سوال کر بیٹھا کہ جب اقبال آپ کی اس حد تک کمزوری ہے تو آپ شاعرِ اسلام کے ہاتھ پر بیعت کرکے مشرف بہ اسلام کیوں نہ ہوگئے؟۔ (ص ۱۱)

یہاں آخری جملہ ماضی کے متعلق استفسار ہے لیکن اپنی سوانح میں انہوں نے جہاں آزاد کو مستقبل کے لیے تبدیلِ مذہب کی دعوت دی ہے وہاں آزاد سے خطاب کیا

«آپ اس «برہمن زادہ» کی وحدانی اسلامیت سے کیوں کر بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو من میں ڈوب کر محسوس کرتے ہیں تو آپ کو اب تک مشرف بہ اسلام ہونے سے کس چیز نے مانع رکھا ہے؟ گہرے سوچ میں پڑگئے۔ میں نے اپنے سوال کے نشتر کو اور زیادہ گہرا نہیں چبھویا» [۱]

۱　ورودِ مسعود، پٹنہ، ص ۲۹۵۔ حیرت ہے کہ کتاب کے ایڈیشن میں کہیں سنہ اشاعت درج نہیں۔

مجھے آزاد صاحب نے بتایا کہ میں ایسے سوال کا کیا جواب دیتا۔ اسلام میرا موضوع ہے ، مذہب نہیں۔

مسعود حسین خان نے آزاد کو مجموعۂ اضداد کیوں کہا انھوں نے اقبال کو (شاعر اسلام) کہا ہے اور ایک ہندو کی ان سے عقیدت مجمع اضداد ہے میں عرض کردوں کہ میں بھی اقبال کو اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں حالانکہ میں پوشیدہ مسلمان تو درکنار، ہم مسلمان بھی نہیں مسعود صاحب آزاد کے بارے میں بڑی جرأت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

(بعض مصلحتوں کے پیش نظر انھوں نے ترقی پسندی کے ساتھ بھی تاک جھانک کی ہے حالانکہ شاعرانہ شہرت کے لیے انہیں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ایسے مقامات پر وہ سپاٹ ہوگئے۔) (ص ١١)

چند مضامین کے بعد مرتب ایم حبیب خان کا (پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے انٹرویو، سامنے آتا ہے (ص ٢٦ تا ٣٨)۔ میں اس کے صرف دو اندراجات کا ذکر کرتا ہوں۔

آزاد صرف اقبال، میر اور غالب کو اردو کے عظیم شاعر مانتے ہیں، کسی چوتھے کو نہیں (ص ٣)

مسعود حسین خان نے اپنی سوانح میں اقبال کے اشعار ع : خودی کا سر نہاں لا اِلٰہ الا اللہ، وغیرہ درج کرکے آزاد سے پوچھا تھا کہ وہ اس طرح کے کلام کو کس طرح انگیز کرتے ہیں، اس کے جواب میں آزاد اعلان کرتے ہیں

(اس کا جواب صرف اتنا ہی ہے کہ یہ اشارے پرانے مذہب یعنی ویدک دھرم کی حقیقت مجھ پر آشکار کرتے ہیں۔ اگرچہ عملی طور پر میں مذہب سے لاتعلق ہوں لیکن فکری اعتبار سے اور Theoretically میرا تعلق ہندوؤں کی اس جماعت سے ہے جو بت پرستی کے خلاف ہے، ویدک دھرم یا آریہ دھرم لا اِلٰہ الا اللہ ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ سوامی ورجانند اور سوامی دیانند سرسوتی نے ویدک

دھرم کی یہی تاویل ہمارے سامنے رکھی ہے اور میں اسی کا قائل ہوں۔)
(ص ۳۶)

بات صاف ہوگئی کہ آزاد مذہباً آریہ سماجی ہیں یہ سند وقتِ ضرورت کام آئے گی اسد اللہ وانی کی مرتبہ توقیت کے بعد ایم حبیب خان کا مضمون (پروفیسر جگن ناتھ آزاد مشاہیر کی نظر میں) ہے جس میں بعض مشاہیر کی مختلف رائیں ہیں

غرضیکہ کتاب نما کا یہ دیدہ زیب شمارہ اپنے اندر ذہن و قلب کی درخشانی کے لیے بہت سے گوہر و جواہر رکھتا ہے

آزادیات کے ساتوں مجموعوں کے جائزے کے بعد میں اپنے تاثرات درج قرطاس کرنا چاہتا ہوں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک شخص تخلیق کار بھی ہو اور تنقید و تحقیق میں بھی گہری نظر رکھتا ہو آزاد میں یہ دونوں متضاد صلاحیتیں جمع ہوگئی ہیں۔ تنقید و تحقیق میں ان کا مہتم بالشان موضوع اقبالیات ہے جس میں انھوں نے کتابوں کی جھڑی لگا دی ہے وہ اقبال کے عقیدت مند اور پرستار ہیں یہ جذبہ نقاد و محقق کے لیے سم قاتل ثابت ہوتا ہے اسی لیے اقبال پر ان کی تحریروں کی بعض جزئیات سے دوسرے ماہرین اقبال نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر یہ ماننا ہوگا کہ وہ اقبالیات میں جس قدر ڈوبے ہوتے ہیں، ہندوستان میں کوئی دوسرا قلم کار نہیں

آزاد کے مقام اور اکتساب کا اندازہ کرنا ہو تو ارمغان آزاد میں اسد اللہ وانی کی تحریر (جگن ناتھ آزاد ماہ و سال کے آئینے میں) کی ورق گردانی کیجیے یہ بات ہے ۱۹۹۳ع تک کی ہے اب اس میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہوگا ان کے اکتسابات کو دیکھ کر منہ سے کلمات سبحانیہ اللہ، المطمئنہ نکلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ایک پہاڑ کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں جس سے نہ صرف چوہے اور گلہری کو بلکہ اونٹ کو بھی احساسِ کمتری ہوتا ہے۔ ارمغان کے اوراق پلٹیے ان کے عہدوں میں آخری دو ہیں۔ ۱ پروفیسر و صدر شعبۂ جموں یونیورسٹی

۱۹۷۷ع تا ۱۹۸۴ع ۲ ایمیریٹس فیلو، ۱۹۸۴ع سے تاحیات دونوں غیر معمولی ہیں

آزاد اردو کے ایم اے ہیں، فارسی کے ہیں جموں یونیورسٹی میں آنے سے پہلے انہیں تدریس کا کوئی تجربہ نہ تھا ان دونوں کی کمی کے باوجود پروفیسر مقرر کیے جانے کی نظیریں ہیں. عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو کے ابتدائی پروفیسر وحیدالدین سلیم اور مولوی عبدالحق کسی بھی مضمون میں ایم اے نہیں تھے. یو پی میں ابتدائی صدور شعبۂ اردو سید ضامن علی، رشید احمد صدیقی اور مسعود حسن رضوی بھی فارسی کے ایم اے تھے اردو کے نہیں ضامن علی صاحب تدریس کے کسی تجربے کے بغیر الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو مقرر کیے گئے. وحیدالدین سلیم ملک بھر میں اردو کے پہلے پروفیسر تھے غالباً انہیں بھی تدریس کا کوئی تجربہ نہ تھا آزاد کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں فیض احمد فیض کو اردو کی پروفیسری پیش کی گئی گو وہ آئے نہیں وہ انگریزی اور عربی کے ایم اے تھے، اردو کے نہیں، وہ ۱۹۳۵ع سے ۱۹۴۲ع تک انگریزی کے لیکچرر رہے. ۱۹۶۴ع میں ہارون کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے [1] لیکن انہیں اردو تدریس کا کوئی تجربہ نہ تھا اس کے باوجود اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے ہمارے دور میں دوسرے مضامین میں بھی اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں

آزاد کی ایمیریٹس فیلوشپ ایک غیر معمولی اعزاز ہے. ان کے بعد ڈاکٹر سید محمد حسنین، مس کمتروس، حکم چند نیر اور ڈاکٹر اکبر حیدری اردو میں یو جی سی کے فیلو ایمیریٹس مقرر کیے گئے لیکن یہ فیلوشپ آزاد کی فیلوشپ سے بہت کمتر ہے یو جی سی کی فیلوشپ محض دو سال کے لیے ہوتی ہے جس میں چار ہزار روپیے ماہانہ وظیفہ اور دس ہزار روپیے سالانہ متفرق اخراجات کے لیے ملتے ہیں. آزاد کی فیلوشپ جموں یونیورسٹی کی ہے جس کے تحت انہیں پروفیسر کے گریڈ کی آخری تنخواہ اور کئی مزید سہولتیں ملتی ہیں اور یہ حین حیات ہیں.

آزاد پروفیسر ہوتے وقت صرف ایم اے تھے ۱۹۸۹ع میں کشمیر یونیورسٹی

---

۱ ڈاکٹر نصرت چودھری، فیض کی شاعری (ایک مطالعہ) سری نگر ۱۹۸۶ع، ص ۳۰ - ۲۹

نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ سندی ڈگری کے مقابلے میں اعزازی ڈگری کا وقار کہیں زیادہ ہے۔ سندی ڈی لٹ یافتہ تو ہر گلی کوچے میں مل جائیں گے لیکن اعزازی ڈگری عمائدِ سماج و رہنمائے علم و ادب ہی کا بہرہ ہوتی ہے۔

آزاد کی نثر و نظم کی تصانیف بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ اردو کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ہند و پاک میں اُن پر کئی پی ایچ ڈی ہوچکی ہیں۔ ۱۹۹۳ع تک انہوں نے دنیا بھر میں جگہ جگہ کی یونیورسٹیوں میں ۵۵ خطبات دیے ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۸۵ اداروں کے سیمناروں میں حصہ لیا یا تقریبات میں تقریر کی۔ فہرست میں دیکھیے تو ان کی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوگا۔ انہوں نے بیرونی ممالک میں ۲۷ جگہ ریڈیو یا ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کی۔ وہ ۵۳ انجمنوں کے رکن ہیں اور انہیں ۵۷ انعامات و اعزازات مل چکے ہیں۔ اب اُن کی تعداد اور زیادہ ہوگئی ہوگی ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

میں نے اپنی معروف کتاب "تحقیق کا فن" میں فرد کی تحقیق پر مواد کے مآخذ گنائے ہیں۔ آزادیات کی کتابیں دیکھ لیتا تو اِس باب میں اور اضافہ کرسکتا تھا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ مکمل کام کرنے کے لیے اسکالر کو زیرِ تحقیق ادب کے بارے میں کیا کیا مواد جمع کرنا چاہیے۔ اسد اللہ وانی نے آزاد کے بارے میں جو جامع مواد جمع کیا اور اس کی بنا پر دنیا بھر کی صحیح تفصیلات پیش کیں وہ قابلِ تقلید ہے۔

آزاد نہ صرف اقبال کے بارے میں جملہ مواد سے واقف ہیں، وہ خود بھی جس پائے کے محقق ہیں، اردو میں اس کی دوسری مثال ہرگز نہیں ملتی۔ ان کے اچھے شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ چار دانگِ عالم میں ان کی جو پوچھ ہے، اُن کے شیدائی و حلیف جس طرح ملکوں ملکوں میں جوق در جوق ہیں اسے دیکھتے ہوئے انہیں اردو کا سب سے بڑا بین الاقوامی ادیب، ایک گھومتا پھرتا سفیر (Roaming Ambassador) کہا جائے گا۔

• • •

«مستقیم جنگ نامی» کی اردو مثنویاں

از

ڈاکٹر سید سجاد حسین، ریڈر شعبۂ اردو، مدراس یونیورسٹی

غلام اعزالدین خان بہادر مستقیم جنگ نامی، حامد علی خان مرحوم کے فرزند اور سلطان النساء بیگم عرف ننّھی بیگم کے داماد تھے۔ مولف تذکرۂ صبح وطن نواب محمد غوث خان بہادر اعظم نے غلام علی آزاد کے حوالہ سے نامی کی تاریخ پیدائش ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ع) بتائی ہے۔[1] نامی کا تاریخی نام غلام علی تھا جس سے ۱۱۸۱ھ تاریخ نکلتی ہے

مستقیم جنگ نامی کے والد حامد علی خان مرحوم، لکھنؤ کی ایک مشہور و معروف مردم خیز سرزمین گوپامؤ کے رہنے والے تھے۔ آرکاٹ کے والا جاہی خاندان کے زمانے میں گوپامؤ کی بہت سی علم دوست، ادب نواز، دینی و مذہبی علوم کی حامل شخصیتیں مدراس آئیں اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز ہوئیں ان میں ایک حامد علی خان گوپاموی بھی تھے[2] انہیں نواب محمد علی والا جاہ سے رشتۂ وطنیت کے علاوہ قریبی رشتہ داری بھی تھی

غلام اعزالدین خان بہادر مستقیم جنگ نامی مدراس میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد مختلف اساتذۂ وقت سے عربی اور فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں مولوی حافظ محمد حسین سے فن عروض سیکھا[3] اور علامہ روزگار مولانا باقر آگاہ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوا۔[4] اسطرح عربی و فارسی علوم و فنون میں انہیں خاصی مہارت حاصل ہوگئی بچپن ہی سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی چنانچہ شعر کہنا شروع کیا اس فن میں مولانا باقر آگاہ جیسی

---

۱ تذکرۂ صبح وطن، نواب محمد غوث خان اعظم، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۲ع

۲ دو بہار عشق مرتبہ محمد یوسف کوکن، ص ۱، مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۵ع

۳ اشارات بینش، سید مرتضیٰ بینش مطبوعہ مدراس ۱۲۶۸ھ

۴ بحوالہ مدراس میں اردو ادب کی نشو نما، ص ۱۹۰، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، مطبوعہ ۱۹۷۹ حیدر آباد

عقیدہ المثال باقر کی اصلاح و تربیت سے ان کی شاعری کو مزید جلا بخشی اس طرح وہ عربی، فارسی اور اردو ان تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ شاعری میں انہوں نے اپنا تخلص کبھی مستقیم اور کبھی نامی ظاہر کیا ہے۔

نامی کو عمدۃ الامرا کے درباری شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ نواب عمدۃ الامرا جب مسند آرائے ریاست ہوئے تو انہوں نے نامی کو ملک الشعرا اور مستقیم جنگ بہادر کے معزز خطابات سے سرفراز کیا [1] نامی نے ایک اردو دیوان کے علاوہ متعدد مثنویاں مثلاً نو بہار عشق۔ بہارستان عشق۔ سلیمان نامہ۔ وفات نبی۔ گنج قدرت۔ قصۂ فارس۔ قصۂ بی بی مریم اور داستان کلفت وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں نامی کا انتقال ۱۸ جمادی الاول ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ع) کو مدراس میں ہوا [2] اُس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال کی تھی اور آپ کو ساحل مدراس کے قریب اپنے ایک باغ میں سپرد خاک کیا گیا جہاں آج پریسیڈینسی کالج قائم ہے۔

مستقیم جنگ نامی کی مذکورہ بالا اردو مثنویوں میں راقم الحروف نے نو بہار عشق۔ بہارستان عشق۔ سلیمان نامہ۔ گنج قدرت اور وفات نبی کا تعارف اور جائزہ پیش کیا ہے نامی مثنویاں دستیاب نہ ہوسکیں اسلئے ان کا تذکرہ پیش کرنے سے قاصر ہوں

مستقیم جنگ نامی کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی موصوف کی اُن مثنویوں کے نام کا پتہ چلتا ہے جو (سلیمان نامہ) سے پہلے لکھی گئیں ــــ

کیا پہلے میں نے بحسن انتظام ـــ حکایات شیریں و خسرو تمام
جو بعد اس کے پھر میں نے کھولی زباں ـــ کیا قصۂ قیس و لیلیٰ بیاں
سعادت سے پھر رہنمائی جو کی ـــ لکھا مثنوی وفاتِ نبی
کیا فکر پھر ساقی نامہ وہیں ـــ فارس کا قصہ لکھا بعد ازیں
کہوں اب مفصل جدا و نبی ـــ حکایت سلیمان و بلقیس کی

---

۱ تذکرۂ گلزار اعظم، ص ۳۵۴، نواب غلام غوث خاں اعظم، مطبوعہ مدراس ۱۲۷۲ھ
۲ فرہنگ پرشین اِن کرناٹک، ص ، محمد یوسف کوکن، مطبوعہ مدراس ۱۹۷۴ع

۱۔ مثنوی نوبہار عشق

یہ ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی اس کا دوسرا نام قصہ خسرو شیریں و فرہاد ہے۔ یہ نامی کی اولین اردو مثنوی ہے جو کل تین ہزار سات اشعار پر مشتمل ہے اسمیں ایک مشہور عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے اس مثنوی کی تالیف کے وقت بقول مصنف وہ عمر کے لحاظ سے جوان تھے اور عین جوانی کی یہ اولین تصنیف امید ہے کہ دنیا میں ایک دائم نشانی بن کر رہے گی چنانچہ کہتے ہیں ؎

کہا میں اس کو در عین جوانی	رہے گی جگ میں یہ دائم نشانی
اگرچہ اول یہ تصنیف ہوگی	ولیکن قابل تعریف ہوگی

اس مثنوی کے نام اور سن تالیف سے متعلق مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار سے شہادت ملتی ہے ؎

کیا جب خامہ گلریزی کو اتمام	رکھا میں نوبہار عشق اُسے نام
سن ہجری تھا بارہ سو یہ گیارہ	کہ میں اس مثنوی کے تئیں سنوارا
کہا تاریخ ہاتف از مسرت	کہا نامی ہے یہ شیریں حکایت
	۱۲۱۱ھ

نوبہار عشق کے اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نامی کو اپنی اس تالیف پر صرف ناز ہی نہیں بلکہ اس کے طرز بیان پر بجا طور پر فخر بھی تھا کہتے ہیں ؎

کیا اس بحر میں فکر ایک مہینہ	تو ماہ نو سا نکلا یہ سفینہ
ذرا دیکھو اسے کر غور یارو	کرو دریافت اس کا طور یارو
کہے کوئی اگر یک بیت بہتر	تو کہتے ہیں کہ ہو دیوان کے ہمسر

نوبہار عشق کا قلمی نسخہ کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ خوش خط میں لکھا ہوا ہے اور خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کی زندگی میں ان کی صاحب زادی کے لئے لکھا گیا تھا۔

نامی کی نوبہار عشق کا قصہ دو مشہور شعراء نظامی اور امیر خسرو کی

اسی موضوع پر لکھی ہوئی مثنویوں سے ماخوذ ہے۔ اس قصہ کو اردو میں ڈھالتے وقت نامی نے مذکورہ مثنویوں کی لفظ بہ لفظ پیروی نہیں کی ہے بلکہ حسبِ ضرورت جا بجا حذف و اختصار سے کام لیا ہے نیز زورِ بیاں کی غرض سے محض قصہ کے اہم پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا ہے مثنوی کی زبان صاف سلیس اور سادہ ہے اسمیں نامی نے اپنے استاد آگاہ کی طرح ٹھیٹھ دکنی زبان اختیار نہیں کی بلکہ اس کو نہایت ہی صاف اور عام فہم اردو میں پیش کیا ہے ان کے اظہار بیان میں سادگی، صفائی اور اصلیت پائی جاتی ہے البتہ کہیں کہیں دکنی محاورے بھی در آئے ہیں

اشعار میں سلاست، روانی کے ساتھ ساتھ بقول مصنف رنگینی، حلاوت اور شیرینی بھی پائی جاتی ہے۔

یہ قصۂ خسرو شیریں و فرہاد
کیا ہندی میں سبنے نامی نے ایجاد
ہے رنگینی میں روئے گل سے رنگین
حلاوت میں ہے شیرینی سے شیریں

۲۔ مثنوی بہارستان عشق :

یہ کل دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس کا سال تصنیف ۱۲۱۳ ھ ہے۔ مثنوی کے خاتمے پر نامی نے مادۂ تاریخ نکالا ہے اور اشعار کی تعداد اور مثنوی کے نام کی نشان دہی بھی کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ـــ

دل میں کر تاریخ کا اس کے خیال — جب کیا پیرِ خرد سے میں سوال
یوں کہا ہے کھینچ کر کے آہ سرد — اسکی اب تاریخ ہو گی داغِ درد
۱۲۱۳ ھ

دیکھ یہ سرسبز کشتِ اہل عشق — پھر کہا ہے یہ بہشتِ اہل عشق
۱۲۱۳ ھ

ہے تر و تازہ جو یہ بستانِ عشق نام اس کا ہے بہارستانِ عشق
میں کیا جب اس کے بیتوں کو شمار پایا گنتی میں برابر دو ہزار

مذکورہ مثنوی میں لیلیٰ مجنوں کی مشہور داستان نظم کی گئی ہے داستانی مثنویوں کی عام روایت کے مطابق قصے کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے

کون کر سکتا ہے حمدِ کردگار عقل ہے محو جہاں لیل و نہار
ہوش و فہم و وہم اور ذہن و ذکا اس محل میں سر بسر ہیں نارسا
عقل کی کرسی اگرچہ عرش ہے پر ثنا میں اس کے دایم فرش ہے

حمد و نعت اور واقعہ معراج کے اظہار کے بعد مناجات ہے پھر نواب عمدۃ الامرا بہادر کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے اس کے بعد اپنے دونوں صاحبزادوں، احمد حسین اور حیدر حسین کو مختلف نصیحتیں کی ہیں اور ان کو علم دین حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے یوں لکھا ہے

ایک نکتہ ہے خردمندوں کو بس علم دیں حاصل کرو نامی ہوس
علم دیں فقہ است و تفسیر و حدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث
ہووے فرزندوں کو میرے عنقریب یاالٰہی علم کی دولت نصیب

سبب تصنیف کے بیان میں جامی کی پیروی کا اعتراف کرتے ہوئے نامی اسکی شاعرانہ عظمت کے اسطرح قائل ہیں

وہ نظامی جو ولی اللہ تھا مثنوی گویوں میں شاہنشاہ تھا
اس لئے اس کی جو کر کے پیروی بولتا ہوں میں یہ ہندی مثنوی

مثنوی کے سبب تالیف کے بعد نامی ناقدری زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے اسطرح رقمطراز ہیں

ہے امید آفریں نامی خیال اس زمانے میں نہیں قدر کمال
چاشنی اس کی نہیں اس دہر میں جانتے نہیں فرق شہد و زہر میں
قدرِ علم و فضل اب بالکل نہیں اصل میں اس عصر کے یہ گل نہیں

شاعـــراں پہلے ہیں ایسے ہر کہیں ورں کی بھی جس کو پہچانت نہیں
قافیہ جانے نہ پہچانیں ردیف ایسے اپنے شعر پر ان کے حریف
ہیں فصاحت میں ورس بے امتیاز شعر مہمل پر ہے اپنے ان کو ناز
شاعری میں ہی نہیں کچھ بے بدل ہوں گے وہ سب چیز میں ضرب المثل

اس مثنوی میں قدیم روایات و رسم کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اسمیں تخیلات کی بلند پروازی سے زیادہ افسانوی حقیقت نظر آتی ہے قصہ رومانی حیثیت رکھتے ہوئے بھی کسی طرح رومانٹک نہیں ہے موضوع اہم اور مفید نہ ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے عشق و محبت کی داستاں ہے لیکن ایسے دامن میں دینی، علمی اور سماجی تصورات کے گہرے نقوش رکھتی ہے جو اُس وقت کے معیار زندگی کی بھرپور ترجمان ہے اس مثنوی کی زبان سلیس اور پیرایۂ بیان پر لطف و دلکش ہے ایجاز و اختصار اس مثنوی کا خاص جوہر ہے صنعتوں کا استعمال بڑی خوبی سے ہوا ہے جس کی وجہ سے قصے میں لطف اور دلچسپی دوبالا ہوجاتی ہے نامی نے اس مثنوی میں جہاں کہیں بھی دکھنی روز مرہ کا استعمال کیا ہے علی الاعلان کیا ہے چنانچہ خود ہی خاتمۂ کتاب میں کہتے ہیں ؎

نظم یہ اردو زباں میں، میں کیا فکر میں اس کے بہت محنت سہا
روز مرہ میں جو اس کے ہو خلل ماں نہیں ایـــراں کا ہرگز محـــل
کیونکہ کرناٹک میں ہے میرا مقام یاں کے لوگوں کی زباں دکھنی تمام
ہـــند ہے میرے بزرگوں کا وطن مولد اس عاصی کا ہے چیناپٹن[1]
منصفو انصاف سے دیکھـــو ذرا مثنوی کس دھوم سے نامی کہا[2]

۳۔ مدینۃ الانوار موسوم بہ وفات نبی۔

یہ مثنوی ۱۲۱۹ھ میں تصنیف ہوئی اسمیں چھوٹی بحر کے تقریباً ۱۲۰۰ شعر ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ خاندان شرف الملک دیوان صاحب باغ

۱ مدراس کا قدیم نام

۲ نامی، بہارستان عشق مخطوطہ نمبر ۴۷۵، اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد

مدراس میں محفوظ ہے کتابت صاف اور دیدہ زیب ہے۔ مثنوی کے خاتمے میں موجود قطعۂ تاریخ سے مثنوی کے نام اور سن تصنیف کی شہادت ملتی ہے ؎

اس رسالے کو میں نے کر تیار — نام رکھا مدینۃ الانوار
ختم کر جب وفات کا احوال — اس کی تاریخ کا کیا میں خیال
سن کے ہاتف نے یہ کہا رو رو
صلوٰۃ خدا، نبی پہ پڑو

۱۲۱۹ھ

اس مختصر مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ مرض و وفات نظم کئے گئے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مثنوی دراصل روایات و احادیث کا منظوم ترجمہ ہے۔ حمد، نعت اور مناجات کے بعد نامی اپنے اُستاد کی مدح سرائی میں اشعار قلم بند کر کے اپنا حق شاگردی اسطرح ادا کرتے ہیں ؎

منبع فضل مولوی باقر — عالم علم باطن و ظاہر
اس قدر علم کا ہے اسمیں کمال — جسکی اس عصر میں نہیں ہے مثال
فقہ و تفسیر اور حدیث و سیر — اسکو اس علم میں ہے خوب خبر
عربی فارسی میں کامل ہے — نظم اور نثر بیچ فاضل ہے
ہے تصانیف اس کے بے تعداد — اس زمانے کا ہے بڑا استاد
عالم با عمل ہے وہ واللہ — اسکو کہنا بجا ہے حق آگاہ
سب فضائل میں یہی گرامی ہے — ثانی نظامی و جامی ہے
دیکھ کر اس کی قدرت تصنیف — کہے علامہ اس کو میر و شریف

اس کے بعد سبب تالیف کا بیان ہے جو نامی پر طاری شدہ غم و الم کے سیاہ بادلوں سے نجات حاصل کرنے اور حضور اقدس کی وفاتِ حسرت آیات کے احوال لکھنے کی طرف مائل ہونے کی تفصیل پر محیط ہے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا کہوں کس طرح تھا میں مغموم — حال میرے خدا کو تھا معلوم
اسمیں پیر خرد شتاب آ کر — یوں لگا کہنے مجھ کو سمجھا کر
کیوں تو بیٹھا ہے اس قدر دلگیر — تو جوانی میں کیوں ہوا ہے پیر

غم دنیا سے کیا تجھے حاصل واسطے اسکی کیوں ہے تو بے دل
عمر ضایع نہ کر تو اس غم میں اس الم سے نہ رہ تو ماتم میں
مت تو دنیا کا درد ہر دم کر نامۂ معصیت کو دھویا کر
اب تو رقت سے دل کی کہہ فی الحال مصطفیٰ کی وفات کا احوال
سنتے ہی پیر عقل سے یہ بات غم دنیا سے میں نے دھویا ہاتھ
اور میں مستعد ہوا اس پر کہ کروں سیر گلستاں سیر

مثنوی کا اصل موضوع احوال مرض الموت اور وفات نبی پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں نامی نے ایک سچے عاشق رسول کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری و وفات سے متعلق تمام حالات معتبر روایات کی روشنی میں نظم کئے ہیں مرض کے دوران حضور کی وصیتیں، ہدایات و خطبات کو الگ الگ سرخیوں کے تحت تفصیل سے سمیٹا گیا ہے نیز حضرت ابوبکر، حضرت عائشہ، حضرت فاطمہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی معتبر روایتوں سے حضور کے مرض و وفات سے منسوب سارے واقعات اس مثنوی میں پیش کردئے گئے ہیں۔ آخر میں نامی مزار اقدس کی زیارت کی تمنا دل میں لئے اللہ سے اسطرح دعا کرتے ہیں ؎

یا الٰہی زیارت سالار کرے میسر نصیب یوں یکبار
پھر محبت نبی کی سینے میں جلد پہنچا مجھے مدینے میں
رہے وابستہ یا الٰہی سدا سر مرا اور آستاں اس کا
کر مرے تن کو بعد ممات خاک کوئے نبی علیہ الصلوٰۃ
اور شفاعت دے اسکی روز قیام مجھکو یا ذوالجلال والاکرام

یہ مختصر مثنوی ۱۲۹۱ھ میں مطبع نظام المطابع مدراس سے شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی زبان اول الذکر دو مثنویوں کے مقابلے میں نہایت ہی شستہ اور صاف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نامی کی یہ مثنوی زبان و اسلوب نگارش کے ارتقائی مدارج کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ مثنوی کے نفس موضوع کو دیکھ کر یہ خیال گذرتا ہے کہ نامی نے یہ مثنوی ثواب آخرت کمانے کے لئے لکھی ہوگی

یہی وجہ ہے کہ جذبۂ خلوص میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ اردو کی قدیم مثنویوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴ سلیمان نامہ موسوم بہ بوستان بہشت :

یہ طویل مثنوی بقول مصنف ۱۲۲۵ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۲۶ھ میں تقریباً ایک سال بعد اختتام کو پہنچی

جو پوچھا میں سال شروع کتاب | کہا روضۂ حور نے کر حساب
نکایک سروش سعادت سرشت | کہا ہے بدا بوستان بہشت
۱۲۲۶ھ

نامی کی یہ سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خاندان شرف الملک دیوان صاحب باغ مدراس میں محفوظ ہے کتابت نہایت صاف ستھری ہے۔ مثنوی کے کل اشعار کی تعداد تقریباً ۳۹۰۰ ہے یہ مثنوی بڑی تقطیع پر لکھی ہوئی ۲۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۱۵ شعر درج ہیں اس مثنوی کا نفس موضوع حضرت سلیمان کا وہ مشہور قصہ ہے جو قرآن اور تفسیروں میں بیان ہوا ہے

قصہ کا آغاز حسب روایت حمد و نعت اور احوال معراج سے ہوتا ہے اس کے بعد مصنف نے کتاب کی تصنیف کا سبب مندرجہ ذیل اشعار میں ظاہر کیا ہے

مجھے ایک دن دل میں آیا خیال | کہ جاتے ہیں سب رائگاں ماہ و سال
یہ ہوتا ہے دین کا نہ دنیا کا کام | گذرتی ہیں بے فائدہ صبح و شام
زمانے کی فکروں میں جاتی ہے عمر | جو جاتی ہے پھر کر کب آتی ہے عمر
کچھ اس زندگی کا بھروسہ نہیں | کوئی جگ میں دایم جیا ہے کبھی
اسی کا ہوا جگ میں مشہور نام | کیا جس نے کرکے بھلائی کا کام
بفضل خدا میں ہوں صاحب سخن | سخن کہنے میں کیوں نہ کھولوں دہن
کوئی مثنوی اور تازہ لکھوں | مناسب نہیں ہے کہ یوں چپ رہوں

کہوں اب مفصل حدا و سبی حکایت سلیمان و بلقیس کی
کروں اسکی تفصیل سے اب بیان نہایت عجائب ہے یہ داستان

داستان حضرت سلیمان و بلقیس کا لب لباب یہ ہے کہ جب حضرت داؤد کے انتقال کا وقت قریب آیا تو خدا نے حضرت جبرئیل کو بھیجا تاکہ حضرت داؤد کے اٹھارہ لڑکوں سے مختلف سوال کئے جائیں جو لڑکا صحیح جواب دے اسکو سلطنت عطا کی جائے چنانچہ جبرئیل نے ان سب سے یکے بعد دیگرے مختلف سوالات کئے ان میں حضرت سلیمان نے صحیح جوابات دئے جس کی بنا پر انہیں انگوٹھی عطا ہوئی جس میں جن و پری اور دیوؤں کی تسخیر کی طاقت موجود تھی۔ اللہ کے حکم سے حضرت سلیمان بیت المقدس کی تعمیر کرتے ہیں اور پھر تمام جن و انس اور چرند پرند کو دعوت دیتے ہیں مگر ایک مچھلی دریا سے نکل کر سارے لوازمات ہضم کرجاتی ہے اس کے بعد حضرت سلیمان کی بادشاہ نوبرہ سے جنگ ہوتی ہے اور آپ اسکی بیٹی سے شادی کرتے ہیں اس اثنا میں آپ کی انگوٹھی چوری ہوجاتی ہے اور حکومت بھی چلی جاتی ہے پھر آپ ایک عورت سے نکاح کرتے ہیں تو دوبارہ انگوٹھی بھی واپس مل جاتی ہے اس کے بعد حضرت سلیمان دو زاہدوں سے ملاقات کرتے ہیں آپ کو پیغمبری ملتی ہے جب آپ سیر کی غرض سے اپنے ساتھی کو لیکر کوہ قاف جاتے ہیں تو وہاں آپ کا ساتھی ایک پری سے شادی کرتا ہے جس کے بطن سے بلقیس پیدا ہوتی ہیں ایک بادشاہ بلقیس کے حسن پر فریفتہ ہوکر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر وہ ناراض ہوکر اس سے جنگ کرتی ہے اور بادشاہ قتل ہوجاتا ہے اسی اثنا میں حضرت سلیمان کے پاس ہدہد شہر صبا سے بلقیس کا پیام لاتا ہے دونوں کے درمیان نامہ و پیام جاری ہوتا ہے اس کے بعد ایک عالی شان محل تعمیر ہوتا ہے اور حضرت سلیمان کی بلقیس سے شادی ہوتی ہے ایک مدت تک دونوں کی گذر بسر ہوتی ہے اس کے بعد بلقیس کا انتقال ہوتا ہے اور پھر حضرت سلیمان بھی انتقال کرجاتے ہیں۔

نامی نے اس واقعہ کو دلچسپ بنانے کے لئے جا بجا نہایت شگفتہ زبان اور دلکش انداز بیان اختیار کیا ہے بعض مقامات پر ان کی زبان اتنی رواں اور الفاظ

کا انتخاب اتنا فطری نظر آتا ہے کہ اگر ہم مذکورہ مثنوی کے اشعار کو نامی سے منسوب نہ کریں تو بلا شبہ ہمارے دل میں میر حسن اور نسیم کا گمان گذرنے لگتا ہے۔ یہاں اسکی تصدیق کے لئے نامی اور میر حسن کے اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں ؎

نامی

عرب کے جزیرہ میں ہے ایک شاہ
کہ صاحب خزانہ ہے صاحب سپاہ
بہت فوج رکھتا ہے اور مال بھی
بڑا ملک ہے خوب اقبال بھی
کسی کو وہ خاطر میں لاتا نہیں
تکبر کے مارے سماتا نہیں
کیا فوج تیار وہ نابکار
لڑائی کا کرنے لگا شور شار
کہا شاہ ملک اسکا اب تو تمام
کرو شہروں میں دمبدم قتل عام
لگی ہونے اس ملک میں مار مار
ہوئی قتل فوج سبکی سب ایک بار
فرزند اور زر و سیم سارا گیا
جزا سے گنہ شاہ مارا گیا[1]

میر حسن

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ وہ شہنشاہ گیتی پناہ
بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کئی بادشاہ اسکو دیتے تھے تاج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج
بہت ملک پر جان کھویا کیا
بہت فکر دنیا میں سویا کیا
رہے اس کے اقلیم زیر نگیں
غلامی کریں اسکی خاقان چیں
وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ
کہ ہوئی ہے اب اسکی حالت تباہ
لٹایا بہت باپ نے مال و زر
ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر[2]

غرض کہ قصے کی ترتیب، خارجی مناظر اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی حسن ادا اور زور بیان کے اعتبار سے نامی کی یہ مثنوی آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کے قدیم اردو ادب میں گوہر شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ واقعی ایک ایسی یادگار ہے جس سے امر کا نام تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

---

۱ نامی، سلیمان نامہ
۲ مثنوی سحر البیان، میر حسن

۵۔ گنج قـــدرت

مستقیم جنگ نامی کی یہ مثنوی احوال قادر ولی اور ان کی کرامات کے بیان میں ہے اس مثنوی میں کل ۱۷۳۰ ابیات ہیں۔ اس کا ایک قلمـــی نسخہ کتب خانۂ عام اہل اسلام مدراس میں محفوظ ہے۔ مثنوی کا نام اور اسکی تاریخ تصنیف کے بارے میں نامی اسطرح رقمطراز ہیں ـــــہ

یہاں نامی تو لکھ تاریخ اور نام | بیاں کر جلد اس کا سال اتمام
سنی جب یہ کتاب با سعادت | رکھا نام اس کا گنج قـــدرت
کیا میں فکر تاریخ بطاعت | کہا ہاتف نے اشعار کـــرامت
۱۲۳۳ھ

یہ مثنوی مطبع عزیزیہ مدراس سے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ع) میں شائع ہوچکی ہے [1] لیکن اس کے مطبوعہ نسخے دستیاب نہیں ہیں

نامی کو اپنی اس مثنوی پر ناز تھا کیونکہ بقول مصنف یہ طویل نظم دو ماہ کے مختصر سے عرصے میں خون پسینہ ایک کر کے لکھی گئی تھی جیسا کہ کہتے ہیں۔ہ

لہو کو کر پسینہ دو مہینے | تراشا لخت دل سے یہ نگینے
سنے جو کوئی یہ نظم دلکش | کرے گا شاد ہو البتہ عش عش
نئے مضموں کو رنگیں کیا ہوں | زمین شعر کو زینت دیا ہوں
جسے کچھ شاعری میں ہوویگی راہ | وہی میرے سخن سے ہوگا آگاہ

نامی کو حضرت قادر ولی عرف شاہ میراں سے والہانہ محبت تھی جیسا کہ وہ اس مثنوی میں اپنی عقیدت اور روحانی وابستگی کا اظہار اسطرح کرتے ہیں ـــــہ

میں آگے چار سال اُس جا گیا تھا | مشرف اس زیارت سے ہوا تھا
ارادہ ہے کہ پھر میلے میں اس سال | رسالہ نظر لیکر جاؤں فی الحال
صلہ اس کا شتاب اس شاہ سے لیوں | جو کچھ لینا ہے اس درگاہ سے لیوں

---

۱ نوبہار عشق، مرتبہ محمد یوسف کوکن، مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۵ع

غرض یہ مثنوی حضرت نامی کے جذبۂ عقیدت اور ان کے دلی احساسات کی آئینہ دار ہے۔ نامی نے جنوبی ہند کی جس بزرگ شخصیت کے احوال و کرامات کو موضوع بحث بنایا ہے انہیں دنیا شیخ شاہ الحمید میراں عبد القادر (المتوفی ۹۷۸ھ) المعروف بہ قادر ولی کے نام سے جانتی ہے۔ شاہ الحمید ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۲ع میں مانک پور میں پیدا ہوئے[1] اور کم عمری میں دینی خدمت کے لئے وطن سے نکل کھڑے ہوئے

برہان خان پانڈی مولف تورک والا جاہی کے مطابق حضرت قادر ولی، سید محمد غوث گوالیاری کی ہدایت پر پہلے ترچناپلی نطہر نگر میں نطہر اولیا سے ملاقات کر کے ناگور پہنچے اور یہیں دین و مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے ۹۷۸ھ میں وفات پائی[2] ان کی درگاہ آج بھی زیارت گاہ عام ہے اور یہاں ہر سال عرس بہت دھوم دھام سے ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں

حضرت قادر ولی کے روحانی فیوض و کرامات اور حالات زندگی پر مشتمل ایک مبسوط رسالہ "کنز الکرامات" عربی و فارسی دونوں زبانوں میں دستیاب ہے اسے امیر الملک عماد الدین محمد خان بہادر کی فرمائش پر نامی نے "گنج قدرت" کے نام سے اردو کا منظوم جامہ پہنایا چنانچہ لکھتے ہیں ؎

غرض بیٹا مرا داماد اس کا   مخاطب محی الدولہ[3] سے جو ہوگا
زبانی اس کے مجھکو بول بھیجا   کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا
شتاب اس نثر کو تو نظم کر دے   مضامین تو دُرِ معنی سے بھر دے

اس مثنوی کی زبان بھی صاف و شستہ ہے اشعار میں جو سلاست اور روانی ہے وہ قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں بعض اشعار تو موجودہ دور کی زبان سے

---

۱ معارف، ماہ مئی ۱۹۹۱ع مضمون از شاکرہ بیگم، ص ۳۸۱
۲ تورک والا جاہی، برہان خان پانڈی مرتبہ گورنمنٹ پریس مدراس مطبوعہ ۱۹۵۵ع
۳ محی الدولہ نامی کے فرزند اور امیر الملک عماد الدین محمد خان بہادر کے داماد تھے۔

ہم آہنگ نظر آتے ہیں مثلاً نامی کا یہ شعر ؎

مجھے اس بات کا ناحق گماں ہے ہنر کی قدر دانی اب کہاں ہے

الغرض نامی نے اس مثنوی میں اپنی شعری صلاحیتوں سے یہ واضح کردیا ہے کہ ایک اچھا فن کار ملک کے کسی بھی گوشے میں جنم لے سکتا ہے اس لحاظ سے نامی مدراس کے ایک کامیاب کلاسیکی مثنوی نگار ہیں جن کے یہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ فن کی کارفرمائی بھی بڑی خوبی اور سلیقہ سے ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر نامی کی مثنویوں میں صنائع بدائع، تشبیہ و استعاروں کی موزونیت اور روز مرہ محاوروں کا دلچسپ اور برمحل استعمال قارئین کی توجہ چاہتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی نامی کا کلام ترقی کی منزلوں سے ہمکنار ہے البتہ کہیں کہیں قدیم اور متروک الفاظ کے استعمال کی وجہ سے کلام کے حسن میں قدرے خامی نظر آتی ہے تاہم نامی نے اپنی شاعری میں الفاظ و معنی کے آبدار موتی بکھیر دئے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں ابتذال اور رکاکت پائی نہیں جاتی بلکہ ہر جگہ پاکیزگی اور نفاست کی مہک مشام دماغ کو تر و تازہ کرتی ہے نیز قارئین کو زبان و بیان کے ارتقائی مدارج کا بھی کماحقہ اندازہ ہوجاتا ہے غرض مجموعی طور پر نامی کی شاعری اردو کے کلاسیکی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھی جائیگی۔

• • •

کتابیات

(۱) تذکرۂ اشارات بینش، سید مرتضیٰ بینش مطبوعہ ۱۲۶۸ھ مدراس

(۲) تذکرہ صبح وطن، نواب غلام غوث خان بہادر اعظم مطبوعہ ۱۸۴۲ھ مدراس

(۳) تذکرہ گلزار اعظم، نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم مطبوعہ ۱۲۷۲ھ مدراس

(۴) مدراس میں اردو، نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۳۸ع حیدر آباد

(۵) نوبہار عشق مرتبہ محمد یوسف کوکن مطبوعہ ۱۹۵۵ع مدراس یونیورسٹی

(۶) عربک پرشین ان کرناٹک، محمد یوسف کوکن مطبوعہ ۱۹۷۴ع مدراس

(۷) تاریخ ادب اردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی مطبوعہ ۱۹۷۷ع دہلی

(۸) اردو مثنوی کا ارتقا، سید عقیل رضوی مطبوعہ ۱۹۹۱ع لکھنو

(۹) سحر البیان، میر حسن، مطبوعہ ۱۹۷۵ع الہ آباد

(۱۰) توزک والا جاہی، منشی برہان خاں پانڈی مطبوعہ ۱۹۵۵ع مدراس

(۱۱) مدراس میں اردو (سمینار کے مقالوں کا مجموعہ) مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفان مطبوعہ ۱۹۹۲ع وانمباڑی

(۱۲) ماہنامہ معارف بابت مئی ۱۹۹۱ع

(۱۳) مثنوی نوبہار عشق، مستقیم جنگ نامی مطبوعہ مدراس

(۱۴) بہارستان عشق، مستقیم جنگ نامی قلمی نسخہ

(۱۵) سلیمان نامہ، مستقیم جنگ نامی، قلمی نسخہ

(۱۶) مدینۃ الانوار موسوم بہ وفات نبی، مستقیم جنگ نامی، قلمی نسخہ

(۱۷) گنج قدرت، مستقیم جنگ نامی، قلمی نسخہ

حضرت بندہ نواز اور دکنی ادب

از

ڈاکٹر طیب انصاری، ۱۱۶۔ڈی ، ایوان شاہی کالونی ، گلبرگہ ۔۵۸۵۱۰۲

حضرت سید محمد گیسو دراز بندہ نواز خانوادہ چشت کے کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ وہ ایک زود نویس نثر نگار بھی ہیں اور پر گو شاعر بھی ہیں۔ ان کی انہی تخلیقی صلاحیتوں کے پیش نظر حضرت پیر نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے انھیں تصنیف و تالیف کے کام کی طرف متوجہ کیا تھا

حضرت بندہ نواز ۴ رجب المرجب ۷۲۱ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۳۲۱ع دہلی میں پیدا ہوئے ابتدائی عمر میں ہی اپنے والد بزرگوار حضرت سید شاہ یوسف راجو قتال حسینی کے ہمراہ دولت آباد منتقل ہوئے۔ لسانی اعتبار سے یہ علاقہ مرہٹ واڑہ کہلاتا ہے اور یہاں دکنی کا چلن ابتدائی صورت میں تھا۔ اس دکنی علاقہ میں حضرت بندہ نواز بمشکل تمام چھ برس بھی رہنے نہیں پائے تھے کہ والد بزرگوار کا ۷۲۱ھ میں وصال ہوگیا اور آپ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ ۷۳۶ھ میں دوبارہ دہلی منتقل ہوگئے گھر کا ماحول چونکہ صوفیانہ تھا اس لئے آپ کی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ چنانچہ آپ ۷۳۶ھ میں اوائل عمر ہی میں اپنے برادر بزرگ حضرت سید شاہ چندن حسینی کے ساتھ حضرت چراغ دہلی کے مرید ہوگئے۔

قطب الدین ایبک کی دہلی منتقلی اور ہندوستان میں ایک نئی سلطنت کے قیام نے ہندوستانی معاشرہ پر بڑے گہرے اور دور رس اثرات چھوڑے۔ سماج کے اندر پائی جانے والی ناانصافی اور نابرابری نے اسلامی تعلیمات کو برگ و بار لانے کے اچھے مواقع فراہم کئے۔ انسانی مساوات، انصاف، بھائی چارہ اور محبت ایسی قدریں تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے عوام اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ ان خصوصی حالات میں اولیائے کرام نے اپنے علم اور عمل کے ذریعہ اسلام کی دعوت دی اور ان کی خانقاہیں انسانی برادری کے مراکز بن گئے۔ دہلی ان دنوں اہل دل اور اہل سیف کا مرکز تھی۔ اہل سیف نے علاقوں کو فتح کیا تو اہل دل نے دلوں کو مسخر کیا۔ حضرت بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیاء اور

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی خانقاہیں ایک کے بعد دیگر روحانی فیضان کا سرچشمہ بن گئیں۔ ان اولیاء کی تربیت میں حضرت شمس الدین کی درسگاہ نے جنہیں سلطان نے مستوفی الہند کا عہدہ اور شمس الممالک کا خطاب دیا تھا کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اس درس گاہ کے فیض یافتگان میں حضرت فخر الدین ناقلہ، مولانا برہان الدین کے علاوہ حضرت نظام الدین بھی شامل ہیں۔[1] حضرت شمس الدین کے فرزند حضرت تاج الدین اور ان کے پوتے حضرت شمس الممالک صدر الدین انصاری اور حضرت برہان الدین انصاری بھی اس درس گاہ سے مستفید ہوئے۔ گویا دہلی اس زمانہ میں تصوف کا گہوارہ بھی تھی اور مرکز بھی۔ اس ماحول میں ظاہر ہے حضرت بندہ نواز کا تصوف کی طرف مائل ہونا اور علوم دینی کا حاصل کرنا ایک امر لازم تھا۔

حضرت بندہ نواز کا قیام دلی میں طویل عرصہ تک رہا ہے وہ ۷۳۶ ھ سے لیکر ۸۰۱ ھ تک تقریباً ساٹھ برس خانقاہ چراغ دہلی سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۷ رمضان ۷۷۷ ھ میں حضرت پیر نصیر الدین چراغ دہلی کا وصال ہوا۔ وصال پیر کے بعد بھی آپ دہلی میں رہے اور خانقاہ نصیری میں رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے ہیں۔ آپ کے سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ آپ بقلم خود لکھا نہیں کرتے تھے بلکہ مریدوں سے املا کروایا کرتے تھے۔[2]

گلبرگہ شریف میں آپ کی آمد (۸۰۳ ھ) کے بعد سے وصال (۸۲۵ ھ) تک تقریباً بیس، بائیس برس آپ نے گلبرگہ شریف میں قیام فرمایا۔ جس وقت آپ گلبرگہ شریف تشریف لائے اس وقت آپکی عمر اسی (۸۰) برس تھی۔ آپ کا وصال ایکسو پانچ سال کی عمر میں ہوا۔ گلبرگہ کے دوران قیام میں یقیناً آپ نے رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا ہے لیکن یہ کہنا کہ اس آخری عمر میں آپ نے دکھنی زبان اور اس زبان میں ایسے خیالات کو املا کروایا ہے قرین قیاس نہیں ہے۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ آپ کے کسی بھی سوانح نگار نے آپ کی دکھنی تصانیف کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے خود آپ کے فرزند اکبر حضرت سید شاہ اکبر حسینی نے جوامع کلم میں دکھنی تصانیف کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جب کہ تمام سوانح نگاروں نے آپکی فارسی و عربی کتابوں کا اور شاعری کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ آپ کا پہلا تذکرہ مولانا

محمد علی سامانی نے ۸۳۱ھ میں قلمبند کیا جو سیر محمدی کے نام سے مشہور ہے دوسرے تذکرہ نگاروں میں مولانا عبدالعزیز بن ملک شیر بن محمد واعظی (تاریخ حبیبی ۸۴۹ھ)، مولانا جوان بما علی شاہ (تاریخ محمدیہ ۱۳۱۸ھ) اور سید بن اللہ بن سید علی محمد الحسینی (نصرۃ الخوارقات ۹۸۱ھ) اہمیت رکھتے ہیں ان چاروں تذکرہ نگاروں نے حضرت بندہ نواز کی صرف فارسی و عربی تصانیف اور ان رسالوں میں آپ کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ چاروں ہی تذکروں میں آپ کی دکھنی تصانیف کا کوئی اشارہ نہیں ملتا خصوصاً محمد علی سامانی نے سیر محمدی آپ کے انتقال کے فوراً بعد یعنی صرف پانچ برس کے اندر ضبط تحریر میں لایا ہے محمد علی سامانی کی دکنی نثر و نظم سے متعلق خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت بندہ نواز نے دکنی زبان میں نہ تو نثر لکھی ہے اور نہ ہی شعر کہا ہے۔

مولانا عبدالعزیز ابن شیر ملک، عہد علاء الدین بہمنی (بیدر) کے مشہور مورخ اور صوفی ہیں اور حضرت سید اللہ حسینی نبیرہ حضرت بندہ نواز کے مرید ہیں ان کی تصنیف تاریخ حبیبی سیرۃ بندہ نواز کا دوسرا اہم ماخذ ہے مولانا عبدالعزیز نے حضرت بندہ نواز کی علمی خدمات کے بارے میں لکھا ہے:

(حضرت قطبی کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ہیں پہلی قسم وہ ہے جو آپ نے دہلی میں شہر احسن آباد (گلبرگہ) کے اثنائے راہ میں لکھائی ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو دارالبرکتہ احسن آباد (گلبرگہ) میں آپ نے لکھائیں، ۲

قیام دہلی کے دوران حضرت بندہ نواز نے دو کتابیں تفسیر ملتقط اور دوسری مسائل نحو اور معنی و بیان سے متعلق (نامکمل) تحریر کروائیں اثنائے راہ میں کشاف (حاشیہ)، اشارات المشارق، رایت ربی فی احسن صورۃ سے متعلق رسالہ، شجرہ نسب، رسالہ قشیریہ (شرح) عوارف المعارف (شرح)، فصوص الحکم (شرح) خلافت نامہ، رسالہ بودیست و باشد. شیخ محی الدین ابن العربی کے رسالہ کا ترجمہ، رسالہ ستقامت شریعت، حظائر القدس معروف بہ عشق نامہ شرح تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی، تصنیف کیا ہے اور ملفوظات جنہیں حضرت اکبر حسینی نے ضبط تحریر

میں لایا۔ گلبرگہ کے دوران قیام میں ترجمہ مشارق، سیرت النبی صلعم، مخصوص اوراد، شرح فقہ اکبر، فقہ اکبر (فارسی)، شرح قصیدہ امالی، شرح عقیدہ حافظیہ مع فضائل خلفائے راشدین، ضرب الامثال، قوت القلوب کا حاشیہ، عقیدہ، شرح رسالہ قشیری، شرح عوارف (فارسی)، آداب المریدین (چار جلدوں میں) برہان فارسی و عربی علیحدہ علیحدہ اسماء الاسرار، حدائق الانس، خاتمہ آداب المریدین اور ان کے علاوہ مکتوبات وغیرہ لکھیں۔ ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ بھی بعض کتابیں تحقیق طلب ہیں لیکن یہ ساری تصانیف یا تو فارسی زبان میں ہیں یا عربی میں۔ ان تصانیف کے مطالعہ سے یقیناً حضرت بندہ نواز کی فکر رسا اور بلندیٔ خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ سلسلہ چشتیہ بہشتیہ کے بزرگوں میں آپ کا مقام بحیثیتِ مصنف بلند ہے۔

حضرت بندہ نواز نے اگر دکنی زبان میں کچھ نہیں لکھا ہے تو اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ اس زمانہ میں دکنی زبان کا وجود ہی نہیں تھا تغلق عہد سے قبل جس طرح شمالی ہند میں اردوئے قدیم/ہندوی زبان کے بعض نمونے حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت امیر خسرو سے منسوب ہیں اسی طرح یہاں دکن میں سلطنت بہمنیہ کے قیام (۱۳۴۷ ع) سے قبل امیرانِ صدہ کے عہد میں دکنی عام بول چال کی زبان بن چکی تھی حضرت ملک المشائخ، مخدوم شیخ علاء الدین انصاری قدس سرہ العزیز کے خانوادہ کے فردِ فرید، اور حضرت سید شاہ یداللہ حسینی نبیرۂ بندہ نواز کے مرید حضرت میاں محمود انصاری الہندی ایسے بزرگ ہیں جن کی فارسی، عربی، ہندی اور دکنی تصانیف کا بعض تاریخوں میں ہمیں ذکر ملتا ہے حضرت بندہ نواز کو دکنی کے اولین نثر نگار قرار دینے کی بات اصل میں مولوی عبدالحق کے اس "قریب قیاس" سے شروع ہوئی جو انہوں رسالہ معراج العاشقین کی ترتیب کے موقع پر کہی تھی۔ حالانکہ معراج العاشقین نام کی کوئی تصنیف کا ذکر دکنی تو دکنی فارسی و عربی رسالوں کی فہرست کتب میں بھی نہیں ہے معراج العاشقین کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے جو کچھ کہا ہے وہ درج ذیل ہے :

"اگر بالفرض یہ تسلیم بھی نہ کیا جائے تو کم از کم یہ ماننے میں کوئی تامل

نہیں ہوسکتا کہ یہ ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے حضرت بندہ نواز کا سن وفات ۸۲۵ھ ہے یعنی اس رسالہ کی کتابت حضرت کی وفات سے اکاسی (۸۱) سال بعد کی ہے اس سے یہ امر قرین قیاس بلکہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے۔ [۴]

اسی «قرین قیاس» کو اُردو کے بہت سے محققین نے یقین کامل کا درجہ دیا اور وہ آج تک کہتے چلے آرہے ہیں کہ «بقول مولوی عبدالحق معراج العاشقین حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہے۔» اور یہ کہ «حضرت بندہ نواز اردو کے اولین نثر نگار ہیں۔» چہ بوالعجبی !!۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کا مصنف کے زیر عنوان سنہ ۱۹۶۸ ع میں تحقیقی مقالہ پیش کیا جسے ڈاکٹر حسینی شاہد نے «دکنی داستان تحقیق کا کارنامہ» قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اندرونی و بیرونی شواہد اور رسالہ تلاوۃ الوجود کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ «معراج العاشقین» کا خواجہ صاحب سے انتساب غلط ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ گیارہوں صدی ہجری کے اواخر اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل کے ایک صوفی حضرت مخدوم حسینی کی تصنیف ہے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں اپنے لیکچر (۱۹۸۹ ع) کے دوران ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق پر چند اعتراضات کئے جس کے نتیجہ میں ایک نئی بحث کا آغاز روزنامہ سیاست (حیدرآباد) کے کالموں میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے مدلل بحث کے ذریعہ ڈاکٹر قتیل کی تحقیق کا دفاع کیا اور نہ صرف ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے اعتراضات ہی کے تعلق سے بلکہ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر مسعود حسین کی رائیوں کو «لسانی قیاس آرائیاں» قرار دیا۔ [۵]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی مولوی عبدالحق کی تحقیق کو «مستم ظریفی» کہا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آخری عمر میں مولوی عبدالحق نے خود ہی اپنے ایک مضمون «اردو زبان و ادب» (مطبوعہ ہم قلم کراچی ۱۹۶۲ ع) میں اپنے پچھلے خیالات کی تردید کردی [۶]

ان تحقیقی حقائق کے باوجود اگر کسی محقق کو اصرار ہے کہ «معراج العاشقین»

حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے تو اس کے اس دعویٰ کے پیچھے ثبوت کی طاقت ہونی چاہئے بغیر دلیل کے دعویٰ نری ہٹ دھرمی ہے اور یہ بات اصول تحقیق کے خلاف ہے ان تمام تصانیف کو جو دکنی زبان میں ہیں اور خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہیں اکبر الدین صدیقی نے مشکوک ٹھہرایا ہے چنانچہ مبارز الدین رفعت نے شکار نامہ کے مقدمہ میں مولوی اکبر الدین کا درج ذیل قول نقل کیا ہے

"حضرت خواجہ بندہ نواز اور ان کے بعد کی بھی کوئی تصنیف مصنف کے شک و شبہ سے خالی نہیں ہے"[7]

خود پروفیسر مبارز الدین رفعت نے شکار نامہ کو بھی حضرت مخدوم حسینی کی تصنیف قرار دیا ہے جو عہد عادلشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ رفعت صاحب نے کلمۃ الحقائق سے مولوی اکبر الدین صدیقی کا ایک اور قول نقل کیا ہے۔

"چنانچہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ شریف میں ایک رسالہ موسومہ شکار نامہ ہے جو غلط طور پر خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہے"[8]

ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنی تصنیف "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" میں اظہار حیرت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دہلی سے جب دوبارہ (حضرت بندہ نواز) گلبرگہ پہنچے تو آپ کی عمر ہجری سن کے حساب سے بیاسی (۸۲) سال کی تھی اس طرح آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا جہاں اس طویل مدت میں دکن سے آپ کا کسی قسم کا تعلق و واسطہ نہ رہا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ وہ متعدد چھوٹے بڑے رسالہ اور کتابیں جو خواجہ صاحب سے منسوب ہیں تمام تر ٹھیٹھ دکنی زبان میں ہیں اور بدنصیب زبان دہلوی جو مسماً آپ کی مادری زبان تھی اور جو پندرہ سال کی عمر سے لیکر بیاسی سال کی عمر تک آپ کے درس و مطالعہ کی واحد زبان رہی چار سطروں کے لئے آپ کی مرہون منت نظر نہیں آتی"[9]

حضرت بندہ نواز سے دکنی کلام بھی منسوب ہے حالانکہ یہ سارا کلام ان

ہی کی اولاد سے تعلق رکھنے والے حضرت شہباز حسینی کا ہے جن کا تعلق عہد عادل شاہی سے ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے دکنی غزل کی نشو و نما میں لکھا ہے :

"سید شہباز حسینی قادری بیجاپوری (متوفی ۱۰۱۵ھ/۱۲۰۶ع) ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت کے ایک صوفی شاعر تھے۔ آپ حضرت شاہ ہدایت اللہ حسینی کے پوتے اور خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ ہدایت اللہ حسینی حضرت بندہ نواز کی اولاد میں تھے اور ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں گلبرگہ سے بیجاپور تشریف لائے اور یہیں ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ع میں انتقال کیا۔"[10]

ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کی تاریخ میں لکھا ہے کہ "شہباز حسینی نے اپنا نام بطور تخلص استعمال کیا ہے اور خواجہ محمد حسینی کے تخلص شہباز کے آگے حسینی لگا کر اپنے تخلص میں امتیاز قائم رکھا۔ ان کی بعض غزلیں بعد میں خواجہ بندہ نواز کی طرف منسوب کردی گئیں"[11]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے قول کے مطابق یہ کلام (جو حضرت بندہ نواز سے منسوب ہے) شہباز حسینی قادری بیجاپوری کا ہے جو ہدایت اللہ حسینی کے پوتے تھے کہ جو بندہ نواز کی اولاد سے تھے۔"[12]

حضرت بندہ نواز کے دکنی نثری و شعری کارناموں سے متعلق مباحث کا یہ لامتناہی سلسلہ محض مولوی عبدالحق کے "قربین قیاس" سے شروع ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق اگر تحقیق و تلاش کے بعد کسی قطعی نتیجہ پر پہونچے ہوتے تو میں سمجھتا ہوں ہمارے محققین نے اس میدان میں اپنا جو سر کھپایا ہے اور جتنا وقت برباد کیا ہے اسکی چنداں ضرورت نہ پڑتی

حضرت بندہ نواز کی بھلے ہی کوئی دکنی تصنیف یا شعری دیوان دستیاب نہ ہوا ہو اس کی وجہ سے حضرت قبلہ کے تبحر علمی میں کوئی فرق پڑنے والا ہے اور نہ ہی ہماری عقیدت و محبت میں کوئی کمی پیدا ہونے والی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خانوادہ چشتیہ کے بزرگوں میں آپ کی حیثیت "سلطان القلم"

کی ہے۔ آپ نے جس طرح اپنی فکر سے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے اور اپنے ذکر سے جس طرح گرمایا ہے وہ ہماری خانقاہی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

• • •

حـــواشی

۱) بزم صوفیہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۲۱۹
۳،۲) تاریخ حبیبی از مولانا عبدالعزیز (اردو ترجمہ) ص ۹۳
۴) مقدمات عبـــدالحق ص ۲۶۹
۵) ماہ نامہ سب رس حیدرآباد حفیظ قتیل نمبر ص ۵۲
۶) ایضاً ص ۴۵
۸،۷) شکار نامہ مرتبہ معارو الدین رفعت ص ۱۸
۹) اردو ادب پر ہندی کا اثر ص ۵۵
۱۰) دکنی غزل کی نشو و نما ص ۲۵۶
۱۱) ایضاً ص ۲۳
۱۲) تاریخ اردو ادب (لاہور ایڈیشن) ص ۲۶۷

(برہم) کی صحافتی خدمات

از

ڈاکٹر صاحب علی، ورپاسی کالج، ممبئی۔ ۱۰

•

اردو زبان و ادب میں حکیم برہم کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے وہ بیک وقت ایک صحافی، شاعر، انشاپرداز، ناول نگار اور مترجم تھے۔ انہوں نے عنفوانِ شباب سے لکھنا شروع کیا اور آخری سانس تک قلم کو رواں رکھا حکیم برہم نے جو کچھ لکھا وہ ایک خاص مقصد اور نصب العین کے تحت لکھا ان کے تمام مضامین عوام کی ذہنی تربیت کے شمار ہیں۔ ڈاکٹر قاضی افضال حسین کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق ان کی تصنیف و تالیف کردہ سات کتابیں صداقت، طاعونی ٹیکہ اور کرشن کنور وغیرہ شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ صحافت اردو کے مورخین نے ان کی صحافتی خدمات کا حسب مرتبہ ذکر نہیں کیا عموماً تذکرہ نگاروں نے بھی ان سے اعتنا نہیں کیا۔ البتہ لالہ سری رام کے (خمخانۂ جاوید) میں برہم کے متعلق چند سطریں ضرور ملتی ہیں اس کے علاوہ ان کا جاری کردہ اخبار (مشرق) سے بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے برہم نے مختلف ادوار سے جن اخبارات کی معاونت کی تھی ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم عبدالکریم برہم بنیادی اعتبار سے ایک بے باک اور اصول پرست صحافی تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دنیائے صحافت کی نذر کردیا تھا۔

برہم کا پورا نام عبدالکریم تھا اور (برہم) تخلص کرتے تھے۔ حکیم برہم فتح پور ضلع بارہ بنکی میں ۱۸۵۹ع میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ جاکر اپنے نانا اور ماموں سے فن طب میں استفادہ کیا۔ اور اس میں مہارت حاصل کی نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد حکومت میں ۱۸۸۷ع میں بھوپال چلے گئے جہاں ۱۹۰۱ع تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اور اپنے حسن انتظام کی وجہ سے بار بار انعام و اکرام کے مورد ہوئے لیکن شاہجہاں بیگم کے انتقال ۱۹۰۱ع کے بعد بھوپال کا قیام مختلف وجوہ سے مفید نہ ہوسکا۔ اس

لئے ۱۹۰۲ ع میں مستعفی ہوکر گورکھپور واپس آگئے

حکیم برہم نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ جو کم و بیش پندرہ سالوں پر مشتمل ہے، بھوپال میں گذارا انہیں چونکہ ابتداء ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی لہذا وہ وہاں کے متعدد مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے لوگوں کو محظوظ کیا اسی زمانے میں ریاض خیر آبادی کے چھوٹے بھائی نیاز احمد بھوپال میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا یہ بھی مشاعروں میں برابر شریک ہوتے انہیں مشاعروں میں نیاز احمد اور برہم کی ملاقات ہوتی اور انہیں کی وساطت سے ریاض تک رسائی ہوئی اور امیر مینائی کے تلمذ نے سونے پر سہاگا کا کام کیا ریاض کے تعلق نے ریاض الاخبار کی نامہ نگاری پر مجبور کیا۔ چنانچہ بھوپال کے دوران قیام میں نہ صرف خبر نگاری کی خدمات انجام دیں بلکہ اپنے مضامین سے بھی اخبار کے وزن و وقار کو بڑھایا اس ضمن میں ریاض خیر آبادی لکھتے ہیں

(اس ہفتہ کے کالموں میں ایک مضمون ہمارے مشہور نامہ نگار برہم کا ہے جس میں ہماری اس رائے سے اتفاق کیا گیا ہے جو ہم نے اخباروں کی انجمن قائم کرنے کے لیئے دی تھی۔)

(ریاض الاخبار، گورکھپور - ۲ دسمبر ۱۸۸۸ ع)

ریاض الاخبار کی نامہ نگاری اور مضمون نویسی نے بعد مکانی کے باوجود دونوں کے تعلقات نے قرب و اختلاط کو فروغ دیا اور حکیم برہم کے ذاتی کوائف بھی زینت اخبار بننے لگے۔ چنانچہ اخبار مذکور کے ایک شمارہ میں یہ مسرت انگیز خبر چھپی۔

(ہم خوشی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ہمارے برق طبع دوست منشی حکیم عبدالکریم برہم فتحپوری ریاست بانسواڑہ ملک راجستھان میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ حضور اول صاحب بہادر کی قدر دانی اور مدار المہام ریاست جناب رائے بہادر منشی جواہر پرشاد کی عنایتوں سے امید قوی ہے کہ اب حکیم صاحب کا پاؤں اس ریاست

سے ذرا مشکل سے نکلے گا۔) (ریاض الاخبار - ۹ ستمبر ۱۸۸۸ء)

قرب مکانی اور ہمہ وقت کا اختلاط رنگ لایا۔ محبت و مودت اور یگانگت نے دونوں کو ایک جان اور دو قالب کا مصداق بنا دیا تھا۔ چنانچہ ریاض نے نہ صرف صلح کل کی ادارت موصوف کے سپرد کی بلکہ ریاض الاخبار، فتنہ عطر فتنہ، میں بھی شریک کیا حتی کہ علالت کے دوران فتنہ عطر فتنہ کا سارا بار ادارت حکیم برہم کے کاندھوں پر آگیا۔ اس ضمن میں ریاض رضواں کے دیباچے میں قاضی تلمذ حسین کا بیان ہے کہ

(برہم مرحوم ۱۹۰۲ء میں گورکھپور آگئے تھے۔ صلح کل کے وہ ایڈیٹر تھے۔ فتنہ عطر فتنہ ریاض نے انہیں دے دیا تھا۔ ریاض الاخبار کی ایڈیٹری بھی انھیں کے سپرد ہوئی)

(ریاض رضواں، دیباچہ قاضی تلمذ حسین، ص ۱۶)

صلح کل ایک روز نامہ تھا جسے ریاض خیر آبادی نے ۱۸۹۵ء میں گورکھپور سے جاری کیا تھا لیکن یہ اخبار زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور جلد ہی بند ہوگیا حکیم برہم اپنے علمی کمالات اور رفعت اخلاق میں اسلاف کے نمونہ تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ قلوب و اذہان کی تعلیم و تربیت کے لیے صحافتی زندگی کو اختیار کیا بلکہ فارغ اوقات میں خدمت خلق کے پیش نظر مطب کا التزام اور غرباء مساکین میں مفت دوائیں تقسیم کرنے کا بھی اہتمام کیا

ریاض خیر آبادی حالات اور راجہ محمود آباد کے اصرار پر ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ چلے آئے چونکہ ریاض الاخبار موصوف کا جزو لاینفک تھا اس لیے اخبار بھی منتقل ہوکر یہیں آگیا تو حکیم برہم نے ۱۹۰۷ء میں اپنا ایک مطبع قائم کیا اور اسی سال مطبع سے ہفت روزہ اخبار (مشرق) جاری کیا جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۹ء تک نکلتا رہا۔ فتنہ عطر فتنہ حکیم برہم کی ادارت میں اپنی رعنائیوں کے ساتھ ۱۹۱۲ء تک شائع ہوتا رہا مگر جب وہ بند ہوگیا تو انھوں نے (رحسافریشن ریویو) کے نام سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا اس میں زیادہ تر

مضامین وحسٹریشن ایکٹ کے متعلق شائع ہوتے تھے چونکہ یہ غیر دلچسپ رسالہ تھا اسلئے بہت دنوں تک نکل نہ سکا اور جلد ہی بند ہوگیا۔

اگرچہ برہم کے اندر حب الوطنی جزو ایمانی تھی مگر وہ فطرتاً شوخ طبع اور رنگین مزاج واقع ہوئے تھے ان کی تحریر و تقریر، شوخی، بذلہ سنجی کا عطر مجموعہ تھی جس سے روح کو نشاط اور جسم کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی وہ لٹھوں اور پھکڑ پن سے نہ صرف کوسوں دور تھے بلکہ وہ تمسخر ریز اب کے عادی اور تہذیب و شائستگی کا پتلا تھے لالہ سری رام کا بیان ہے۔

«(ان کی) طبیعت میں رنگینی اور اس کے ساتھ شوخی بھی ہے»
(خمخانۂ جاوید حصہ اول - لالہ سری رام ص ۵۷۲)

دراصل حکیم برہم کی شوخی اور رنگینی کا اصل سبب لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کا وہ عیش پرور ماحول تھا جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گزارے تھے یہاں سیاست، ادب، سماج، تہذیب، اخلاق اور زندگی کی تمام بے ضابطگیوں، بدعنوانیوں، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا۔ خوب پھبتیاں کسی جاتیں اور مضحکہ اڑایا جاتا اسی ماحول سے نکل کر حکیم برہم نے نثر و نظم میں اپنی شوخی و ظرافت کا مظاہرہ کیا ہے

حکیم برہم نے ریاض الاخبار میں کثرت سے مختلف النوع مضامین لکھے، یہ مضامین سیاسی، سماجی، ادبی اور دوسرے موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ سیاسی موضوعات پر برہم کی تحریریں کم ملتی ہیں لیکن جو ملتی ہیں وہ بہت واضح اور مدلل ہیں۔ مثلاً کانگریس کی بنیاد محض اس غرض سے ڈالی گئی تھی کہ ہندوستانی عوام حاکم وقت سے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کریں مگر رفتہ رفتہ یہ ایک مضبوط سیاسی جماعت بن گئی۔ سر سید نے ابتداء ہی سے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ حکیم برہم بھی اس جماعت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ ریاض الاخبار میں لکھا:

«میں کہتا ہوں اس درخت کی سیوا کرنے والوں نے بے وقت اس درخت کو بویا

اگرچہ زمین نے جڑ پکڑ لی اور ان کے خیال کے مواقف بادشاہ کی کچھ نہیں ہے مگر لگانے والوں نے اول تو ملی نہیں دیکھی ۔ دوسرے رکھوالے جو ہمہ تن اس کے بچانے اور پرورش کرنے میں اوقات صرف کرتے ہیں بہادر نہیں ہیں کہ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے اس کا پھل چکھ سکیں ۔ ۔ ۔ تیسرے یہ کہ پانی جس کنوئیں سے دیا جاتا ہے وہ کھاری ہے سوائے اس کے بنگال کی ہوا مرطوب ہے جو اس کے پھلوں کو شیریں نہ ہونے دے گی ،

(ریاض الاخبار - ۲۵ نومبر ۱۸۸۸ ع)

حکیم برہم کے یہاں شوخی، بذلہ سنجی اور شائستگی کے باوجود حق گوئی اور بے باکی کا احساس جو ہر ہر جملہ سے تراوش کرتا بظــــر آتا ہے، وہ اپنے فرائض منصبی سے واقف تھے۔ اور اس کے تحفظ سے سر مو تجاوز نہ کرتے تھے چنانچہ حکومت برطانیہ کے جلال و جبروت کے باوجود جرأت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا انہوں نے انگریزوں کی نظر میں ہندوستانیوں کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ

، گورنمنٹ کے خیالات رعایائے ہند کے متعلق ابھی تک ویسے ہی ہیں ہم کو ایک پستول کا حکم نہیں، باغی تصور کئے جاتے ہیں۔ ہزار خیر خواہی کے بعد بھی لعنق کا ٹیکہ ہاتھ میں، ہمیشہ ٹیکس وغــــیرہ کا بار۔ عہدے جو ہم کو ملے کوششوں سے، جو یوروپین لندن سے چلا وہیں اس کا نام درج رجسٹر نصیب آوراں ہوگیا ،

(ریاض الاخبار - ۲۵ نومبر ۱۸۸۸ ع)

مذکورہ اقتباس میں ہنــــدوستانیوں کی وفاداری اور فرمانبرداری کے باوجود حکومت کا عدم اعتماد بلکہ بدگمانی، اس پر مستزاد ہندوستانیوں کی بے کسی اور بے بسی اور انگریزوں کے لیئے بے جا مراعات کا بے خوفی کے ساتھ اظہار ملتا ہے۔ اس دور میں یہ جرأت اور حق گوئی حکیم برہم کا حقیقی امتیاز تھی۔

حکیم برہم کی ریاض الاخبار میں جو تحریریں ملتی ہیں ان میں بیشتر کی حیثیت تبصرہ کی ہے برہم کو غالباً اس فن سے خاص شغف تھا وہ کتابوں کا

مطالعہ کرتے اور جو کتاب پسند آجاتی اس پر تبصرہ ضرور کرتے مہتاب داغ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" مشہور شاعر ہندوستان جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی استاد حضور ظل اللہ مکتہ کا تیسرا دیوان ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے گلزار داغ، آفتاب داغ نقش اول اور نقش ثانی تھے تو یہ نقش ثالث حجم میں دونوں دیوانوں سے زیادہ ہے ۔ ۲۶۸ صفحہ پر غزلیات تمام ہوگئیں ہیں ۸ صفحوں پر کچھ متفرق اشعار ردیف وار ہیں ۷۰ اوراقوں پر چھ قصیدے ہیں۔ زبان کے شائستہ ہونے میں بھی کوئی بات حضرت داغ نے نہ اٹھا رکھی اس دیوان میں آسان اور روز مرہ کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ اب کوئی بات باقی نہ رہی جسکی کشش پھر حضرت داغ کو شعر کہنے کی طرف توجہ دلائیگی " (ریاض الاخبار - ۱۴ مارچ ۱۸۹۲ع)

حکیم مرحوم نے ریاض الاخبار میں تبصروں کے علاوہ دیگر ادبی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے معرکہ چکبست و شرر میں ان کے بعض مضامین قابل ذکر ہیں ان مضامین سے ان کی زباں دانی، اصابت رائے اور قوت نقد و نظر کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ چکبست کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے

" سچ تو یہ ہے کہ کسی فن کی تنقید کے لیے اس سے واقفیت بھی ضروری ہے اگر کوئی شخص کہے کہ تاج محل میں یہ نقص رہ گیا ہے تو اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ فن انجنیری سے واقف ہو مسٹر چکبست کی تعلیم انگریزی قاعدے سے بے شک مکمل ہے مگر ان کو شاعری کے نکات اور اس کے فن سے کیا تعلق ہے اگر کچھ واقفیت ہوتی تو وہ امانت مرحوم کی زبان پر اعتراض نہ کرتے " (ریاض الاخبار - یکم ستمبر ۱۹۰۵ع)

حکیم مرحوم ہفت روزہ اخبار ریاض الاخبار سے باضابطہ طور پر ۱۹۰۲ع منسلک ہوئے اور ۱۹۰۷ع یعنی جب تک اخبار گورکھپور میں تھا، وابستہ رہے اور اپنی محنت و سعی سے اس اخبار کے معیار کو برقرار رکھا۔ ریاض الاخبار نے اپنی زندگی کا سفر ۱۸۷۲ع میں خیر آباد سے شروع کیا اور گورکھپور میں طویل زمانہ

گزارنے کے بعد آخری وقت میں لکھنؤ چلا آیا جہاں سے ۱۹۰۹ع تک شائع ہوتا رہا۔ گویا ریاض الاخبار کی خیرآباد سے لکھنؤ تک کی اشاعتی زندگی ۳۷ سال کی طویل مدت پر مبنی ہے جسے تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلا دور ۱۸۷۲ع تا ۱۸۸۱ع ہے، یہ دور مکمل طور پر ریاض اور قصبہ خیرآباد سے تعلق رکھتا ہے اس دور میں ریاض الاخبار ہفتہ وار رخشاں پریس میں طبع ہوتا تھا اس دور کی بیشتر فائلیں نایاب ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۸۲ع سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۰۷ع پر ختم ہوتا ہے اس دور میں ریاض الاخبار قصبہ خیرآباد کے بجائے گورکھپور سے شائع ہونے لگا اور اب یہ ملک گیر اخبار ہوگیا تھا چنانچہ اخبار کی مقبولیت کے پیش نظر حیدرآباد دکن میں بھی ایک دفتر قائم کیا گیا تھا اور ان دنوں یہ اخبار ہفتہ میں دوبار نکلنے لگا تھا ریاض الاخبار گورکھپور کا وہ پہلا اخبار تھا جس نے اس علاقے کی علمی و ادبی فضا پر دیرپا اثرات قائم کئے احسان اللہ عباسی، مہدی افادی، حکیم برہم اور مولوی سبحان اللہ وغیرہ کی ذہنی نشو و نما میں ریاض الاخبار کا بہت اہم رول رہا ہے بقول مہدی افادی

"گورکھپور کی موجودہ نسل دماغی حیثیت سے تمام تر ریاض الاخبار کی پیدا کردہ ہے" (مکاتیب مہدی افادی - بیگم مہدی ص ۱۰۸)

ریاض الاخبار نے گورکھپور میں علم و ادب کی ترقی کے لیے جو ماحول پیدا کیا اس کا تفصیلی ذکر پروفیسر محمود الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے

"ریاض الاخبار کی اشاعت ۱۸۸۲ع میں شروع ہوئی۔ اس کے ذریعے دورِ جدید کے مفید یا مضر اثرات کی باتیں ان حلقوں تک بھی پہنچنے لگیں جو دور جدید کے تصور سے بھی ناواقف تھے ریاض خیرآبادی اگرچہ شاعری کی دنیا میں بڑی حد تک اسلاف کی روایت کے امین تھے لیکن صحافت کے میدان میں وہ ترقی پسند نظر رکھتے تھے۔ ریاض الاخبار ہر اس خبر یا مضمون کا خیر مقدم کرتا تھا جس سے عقل پسندی کو فروغ حاصل ہوا اور لوگوں کو نئے دور کے قبول کرنے پر آمادہ کرسکے اس اخبار نے گورکھپور کی علمی و ادبی رفتار کو تیز تر کردیا"

(صحیفۂ محبت - ڈاکٹر محمود الٰہی مقدمہ ص ۵)

ریاض الاخبار یہی کا وہ دوسرا دور تھا جس میں حکیم برہم کا نام براہِ راست اخبار میں بحیثیت ایڈیٹر درج نہیں ہوتا تھا لیکن کافی دنوں تک ان کی ذات پورے طور سے ریاض الاخبار پر چھائی رہی۔ اخبار کے انتظامی معاملات اور اس کی دیگر ذمہ داریاں حکیم برہم کے سپرد تھیں اس ضمن میں قاضی تلمذ حسین لکھتے ہیں

"ایک پلنگ تھا اور حضرت ریاض تھے اسی پر لکھنا، اسی پر کھانا اور اسی پر سو رہنا کبھی شب پر بستر پھیلایا کبھی شب میں یہ بھی نہیں۔ بیمار ہوئے اور سخت بیمار ہوئے ناچار اپنے بھائی اور بیار کے پاس فرخ آباد چلے گئے . . روزنامہ صلح کل، فتنہ عطر فتنہ یہاں تک کہ ریاض الاخبار کی عنانِ ادارت بھی عارضی طور پر حکیم برہم کو سونپ دی جو بہت دنوں تک اسے بھی چلاتے رہے"　　(ریاض رضوان ص ۷۱۵)

ریاض الاخبار کا تیسرا دور ۱۹۰۷ ع سے شروع ہوکر ۱۹۰۹ ع پر ختم ہوجاتا ہے اس دور میں اخبار گورکھپور سے منتقل ہوکر لکھنؤ آگیا تھا اور یہیں سے ہفتہ میں ہر شنبہ کو ریاض کی ادارت میں شائع ہوتا تھا

ریاض خیرآبادی کا جاری کردہ مزاحیہ پرچہ (فتنہ عطر فتنہ) نے اپنی زندگی کا سفر ۱۸۸۲ ع میں ایک ضمیمہ اخبار کی حیثیت سے شروع کیا تھا مگر اس نے جلد ترقی کرکے علیحدہ اخبار کی حیثیت حاصل کرلی۔ یہ اپنی ظرافت سے عوام کے لطیف مذاق کی ترجمانی کرتا اور انھیں لطف اندوز بھی کرتا تھا یہ اخبار دو جزو پر مشتمل ہوا پہلا جزو فتنہ اور دوسرا عطر فتنہ کے نام سے ہوتا۔ پہلے جزو میں مزاحیہ مضامین، لطیفے اور چٹکلے وغیرہ ہوتے تھے۔ جبکہ دوسرا جزو گلدستوں کے انتخاب پر مشتمل ہوتا تھا اس مزاحیہ پرچہ کی پوری زندگی کو ہم دو ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں پہلا دور ۸ جولائی ۱۸۸۲ ع سے شروع ہوتا ہے اور ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ ع تک چلتا ہے۔ یہ دور مکمل طور پر ریاض خیرآبادی سے متعلق تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ریاض خیرآبادی نے گورکھپور سے فتنہ کو ریاض الاخبار کی حیثیت سے منظر عام پر لانا شروع کردیا تھا۔ ریاض اس کو ظرافت سے اس قدر آراستہ کرتے کہ اخبار نکلتے ہی خلقت اس پر ٹوٹ

پڑتی مگر جب ریاض علیل ہوگیے تو یہ پر دلفریب پرچہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ ع کو شائع ہوکر بند ہوگیا۔

فتنہ عطر فتنہ کا دوسرا دور مئی ۱۹۰۳ ع سے شروع ہوا اور ۱۹۱۲ ع تک چلتا رہا۔ اس دور میں حکیم برہم کی پوری ذات فتنہ عطر فتنہ کی صحافت پر چھا گئی تھی اور انہیں کی ادارت میں یہ دوبارہ جلوہ فگن ہوا تھا اس ضمن میں فتنہ عطر فتنہ کا وہ اشتہار ملاحظہ ہو جو ناظرین کی آگاہی کے لیے "ناظرین فتنہ" کے عنوان سے چھپا تھا

"مئی ۱۹۰۳ ع سے فتنہ عطر فتنہ ہمارے خاص اہتمام سے نکلتا ہے اس وقت ہم نے ایک تعطیل نہ کی نہ کسی ہفتے کا پرچہ بند کیا حالانکہ ہندوستان میں انگریزی، اردو تمام اخباروں کا قاعدہ ہے کہ محرم، چہلم، عید، بقر عید، شب برات، دسہرہ، ہولی، دیوالی اور بسنت کو اخبار کی تعطیل کردیتے ہیں یہاں یہ عالم ہے کہ اس دن کوئی تہوار ہو جب بھی فتنہ نکلے۔ . . جن صاحبوں کے پاس پرچہ ایک ہفتہ کے اندر نہ پہنچے، کارڈ لکھیں تاکہ صاحب پوسٹ ماسٹر کے پاس کاروائی کی جاسکے

حکیم برہم پروپرائٹر پرنٹر و پبلشر نے شائع کیا مطبوعہ مطبع حکیم برہم - گورکھپور

یہ جیبی سائز کا پرچہ جب حکیم برہم کی ادارت میں آیا تو وہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لئے خوب جتن کیے اس کے سابقہ اصول و ضوابط میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ مگر اخبار بجائے یک شنبہ کے ہر بدھ کو شائع ہونے لگا اور پہلے جزو میں طربیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ خبریں بھی شائع کی جانے لگیں اس طرح دوسرے جزو عطر فتنہ میں گلدستوں کا انتخاب شائع کرنے کے بجائے شعراء کو خود مصرعہ طرح دیئے جانے کا اہتمام کیا جانے لگا۔ اور شعرا اپنے تازہ کلام سے براہِ راست پرچہ ہذا کی معاونت کرنے لگے۔ اس طرح یہ پرچہ حکیم برہم کی ادارت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اور

۱۹۱۲ع تک مستقل طور پر شائع ہوتا رہا

فتنہ عطر فتنہ کی فائلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ نے جس ظریفانہ صحافت کی بنیاد اردو میں ڈالی تھی فتنہ عطر فتنہ نے اُسے نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ شائستگی اور شگفتگی کے زیور سے آراستہ بھی کیا مثال کے طور یہاں چند مزاحیہ مضامین درج کئے جاتے ہیں

مارسٹر

پیارے لال صاحب جو امتحان (مارسٹری) پاس کر کے آئے ہیں ان کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا مارسٹر۔ مگر پڑھا گیا (مارشتر) پڑھنے والے صاحب دفتر میں پوچھنے آئے کہ۔ صاحب (مارشتر) کون عہدہ ہے جو ولایت سے امتحان کرنے پر ملتا ہے یہ سن کر اس نے خوش ہونے ترقی کا زمانہ ہے (مارشر) سے بھی (مارشتر) پر ترقی کی۔ (فتنہ عطر فتنہ۔ ۲۱ فروری ۱۸۸۶ ع)

جمع غائب

ایک ساہو جی نے دیکھا دیکھی اپنے لڑکے کو بھی مکتب میں بٹھا دیا کچھ دنوں کے بعد آئے اور پوچھنے لگے کہ میاں صاحب لڑکا کیا پڑھتا ہے میاں صاحب نے (لڑکے سے) کہا۔ آج کا سبق سنا دے لڑکا (آمد نامہ) کھول کر بیٹھ گیا اور لگا دہرانے (آمد آیا وہ ایک مرد۔ صیغہ واحد غائب) تو۔ ساہو جی سے رہا نہ گیا لڑکے کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے چل حرام زادے گھر میاں صاحب تو باپ دادا کی کمائی چار دن میں (جمع غائب) کرانا چاہتا ہے (فتنہ عطر فتنہ۔ ۴ ستمبر ۱۹۰۸ ع)

ماں بیٹی

بیٹی۔ میں وہاں ناچ کے جلسے میں جاؤں گی

ماں۔ کوئی ضرورت نہیں

بیٹی - کیوں ؟

ماں - میں نے ان جلسوں میں کئی حماقتیں دیکھی ہیں۔

بیٹی - (سکوت کے بعد) تو کیا میں ایک بھی حماقت نہ دیکھوں۔

(فتنہ عطر فتنہ - ۲۰ جولائی ۱۹۰۴ع)

نئی بنیاد

ایک صاحب کو فیل پا کا عارضہ شروع ہوچکا تھا زوجہ مقدسہ لحیم و شحیم تھیں اختلاط میں ایک روز بیوی سے کہنے لگے کہ میں نحیف الجثہ ہوں مگر تمہارے بچے کیوں فربہ اندام ہوتے ہیں بیوی نے کہا چونکہ میں خود موٹی تازی ہوں اور بچے میرا دودھ پیتے ہیں، اس لئے توانا اور تندرست ہیں مگر آپ - شوہر نے کہا کہ آخر میں تو تمہارا ہم بستر ہوں کچھ اثر مجھ میں بھی آنا چاہیے تھا عورت نے پیر کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ بنیاد پڑ چلی ہے

(فتنہ عطر فتنہ - ۲۱ جنوری ۱۹۰۵ع)

بحوالہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مضامین اور انداز ظرافت دوسرے مزاحیہ اخبارات سے مختلف تھے علاوہ ازیں قد و قامت اور روپ و رنگ کے لحاظ سے بھی یہ اخبار بالکل فتنہ اور طنز و ظرافت سے جادۂ گل و رنگ تھا۔ اسے طنزیہ اور ظریفانہ ادب میں جو اہم مقام حاصل ہے اس کا سبب فتنہ عطر فتنہ کا اعلی مذاق، مہذب ظرافت اور ذاتی بغض و عناد سے پرہیز ہے۔ اسکی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں

دان مضامین میں زیادہ تر مقامی رنگ و شباب و لذت وطر کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مگر لطافتِ مذاق کا دامن کہیں سے چھوٹتا نہیں تھا اپنے اختصار ظاہری اور ہیئت تصویری کی مناسبت سے فتنہ کے مضامین بھی فقرے، جملے اور چٹکلوں سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے لیکن ان میں تیزی اور شستگی بلا کی تھی ، (طنزیات و مضحکات - رشید احمد صدیقی ص ۱۵۰)

مختصر یہ کہ وہ اخبارات جو ریاض خیر آبادی کے جاری کردہ اور حکیم

برہم کے پروردہ تھے انھوں نے گورکھپور کو صحافتی دنیا سے روشناس کرایا اور اسے تابناک صحافتی زندگی بھی عطا کی۔ ریاض الاخبار میں ان مضامین کو ترجیح دی جاتی جو حدیات سے عاری اور عقل و فہم پر مبنی ہوتے تھے اسی طرح فتنہ عطر فتنہ عام طریقانہ صحافت سے ہٹ کر سنجیدہ طنز و ظرافت کا بہترین نمونہ پیش کرتا تھا مگر ۱۹۰۷ ع میں جب ریاض خیر آبادی نے ریاض الاخبار کو گورکھپور سے اٹھاکر لکھنؤ چلے آئے تو حکیم برہم نے ۱۹۰۷ ع ہی میں اپنا ذاتی ہفت روزہ اخبار (مشرق) کا اجراء کیا اس اجراء کے متعلق گورکھپور گزیٹر لکھتا ہے:

(گورکھپور میں چند سالوں سے ایک یا دو ہندوستانی اخبارات نکلنا شروع ہوئے ہیں ان میں پہلا اخبار ہے ریاض الاخبار ۔ مگر ۱۹۰۷ ع میں لکھنؤ منتقل ہوگیا اس کے بعد مدیر حکیم برہم نے ایک ماہ بعد ایک نیا اخبار (مشرق) جاری کیا یہ ہفتہ وار اخبار ہے اور اس کی تعداد اشاعت چھ سو ہے اس میں مقامی خبریں اور سماجی، مذہبی اور سیاسی موضوعات پر مراسلے شائع ہوتے ہیں

(The District Gazettier of Gorakhpur, Government Press, Allahbad-(1909) P 106)

(مشرق) ہفت وار تھا جو کبھی دس اور کبھی بارہ صفحات پر مشتمل ہر منگل کو شائع ہوتا تھا مگر ۱۹۲۰ ع کی فائلوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار کچھ دنوں تک منگل کے بجائے جمعرات کو نکلتا تھا اس کے سرورق کی پیشانی پر خفیف حروف میں رجسٹریشن نمبر اور اس کے نیچے جلی حروف میں مشرق چھپا ہوتا تھا دائیں طرف شرح خریداری اور بائیں جانب نرخ اشتہارات درج ہوتے تھے اور اس کے ذیل میں یہ عبارت درج ہوتی:

(ہر منگل کو گورکھپور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ سے حکیم برہم پروپرائٹر، ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔)

درج بالا عبارت کے نیچے باقی صفحہ دو حصوں میں منقسم ہوتا اور دونوں طرف مختلف النوع اشتہارات ہوتے تھے۔ مگر اس کے سرورق میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں مثلاً ۹ جنوری ۱۹۱۷ ع سے اخبار کے ذیل حصے میں

پرنٹر و پبلشر کا نام اور دور اجراء چھپنے کے بعد حسبِ ذیل عبارت درج کی جانے لگی :

"ہندو و مسلمانوں میں سچا اتحاد پیدا کرنے کا حامی، ہندو اور مسلمانوں کو دغا اور دھوکے کی حکمتِ عملی سے بچانے والا، حکومت اور رعایا کے تعلقات میں شگفتگی اور حقیقی ہمدردی کا طالب اور ادب کا زبردست معین۔ قیمت چار روپیہ سال پیشگی مابعد دس روپیہ سال لی جاتی ہے ہر منگل کو حکیم برہم مالک و ایڈیٹر کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔"

یہ عبارت درج ہونے کے بعد کا باقی صفحہ دو حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ ایک طرف فہرستِ مضامین اور دوسری طرف ایڈیٹوریل نوٹ ہوتے تھے۔ یہ طور کافی عرصہ تک جاری رہا مگر آخری دنوں میں اخبار کے سرورق سے فہرستِ مضامین کا حصہ ختم کردیا گیا اور صرف ایڈیٹوریل نوٹ ہی درج کئے جانے لگے

اخبار (مشرق) کے مستقل کالم ایڈیٹوریل، مراسلات، ممالک غیر کی خبریں ملک کے مشہور اردو، انگریزی اخبارات سے نقل کی جاتی تھیں (لوکل) صرف گورکھپور سے متعلق خبروں کے کالم کا عنوان ہوتا تھا۔ اس کے تحت عام طور سے افسروں کی نعیناتی ان کے تبادلے اور ادبی نشستوں وغیرہ کی خبریں چھپتی تھیں (لوکل) کے بعد اشتہارات چھپتے تھے

اخبار کے قلمی معاونین میں شبلی نعمانی، حسرت موہانی، مہدی افادی سے لے کر قاضی محمد عدیل عباسی کے نام ملتے ہیں اس میں چھپنے والے چند اہم شاعروں اور مضمون نگاروں کے نام حسبِ ذیل ہیں :

اکبر الہ آبادی، احسن مارہروی، ریاض خیر آبادی، عبدالسلام ندوی، احمد علی شوق قدوائی، مولانا آزاد سبحانی، رشید احمد صدیقی، سید محمد واحد بے خود دہلوی، صفدر مرزا پوری اور شاہ مطر ہاشمی وغیرہ۔

اخبار بہ مذکورہ مخلص معاونین کی بدولت ۲۳ جنوری ۱۹۲۱ء تک برہم کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ان کی وفات کے بعد (مشرق) کا دوسرا دور شروع

ہوتا ہے اور یہ اخبار حکیم عبداللطیف کی ادارت میں شائع ہونے لگتا ہے۔ ان کی ادارت میں چند دنوں تک نکل کر یہ اخبار حکیم مرحوم کے نواسے قربان وارث کی ادارت میں آجاتا ہے اور وہ اس کو ۱۹۵۵ ع تک باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ مگر جب یہ پاکستان چلے گئے تو اخبار کی ساخت کمزور ہوتی گئی اور اخبار بند ہوگیا

اخبار (مشرق) جس وقت نکل رہا تھا اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سارے ہندوستان کے مسلمان اپنے مستقبل کی حفاظت اور اپنی بقا کی ضمانت کے جویا تھے چنانچہ مسلمان دو گروہ میں تقسیم ہوگئے ایک گروہ نے انگریزوں کی موافقت کو اپنی قوم کے لئے مفید تصور کیا تو دوسرے نے انگریزوں کے خلاف صف آرائی کو اپنا مسلک بنایا اول الذکر گروہ کی قیادت سر سید احمد خاں کرتے تھے مشرق اخبار سیاسی اعتبار سے اسی گروہ کا ترجمان تھا چنانچہ اس اخبار میں جگہ جگہ اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ مشرق، مسلمانوں کے لئے سر سید احمد خاں کی پالیسی کو انتہائی مفید سمجھتا ہے ایک جگہ مرحوم لکھتے ہیں

(بہت ضروری بات قابل ذکر گذارش یہ ہے کہ اخبار جس پالیسی پر قائم ہے اس سے کبھی ہٹ نہیں سکتا دنیاوی معاملات میں مسلمانوں کے لئے سر سید کی پالیسی اور ہندوؤں کے لئے مسٹر گوکھلے کی پالیسی کا مؤید ہے یہ لوگ خوشامدی کہے جاسکتے ہیں نہ کہ قوم کے دشمن) (مشرق ۳۰ دسمبر ۱۹۱۲ ع)

ایک دوسری جگہ یہی بات حسب ذیل الفاظ میں تحریر ہے

(ہم سر سید کی صحیح پالیسی پر چلتے ہیں اور قوم کے لئے سر سید کی پالیسی کو دنیاوی معاملات میں ایک ضروری دستور العمل تصور کرتے ہیں اور ہر مسلمان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ سر سید کی پالیسی پر چلے ان کے صحیح خیالات اور جذبات کی پیروی کرے) (مشرق۔ ۳ اگست ۱۹۱۵ ع)

مشرق میں مسلمانوں کے لئے وہ تمام مشورے شائع ہوتے جن پر عمل پیرا

ہو کر مسلمان ترقی کی منزلیں طے کر سکتے تھے یہ اخبار مسلمانوں کو ہمیشہ تعلیمات کو سیاست سے الگ رکھنے کی تلقین کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک کو سیاست میں حصہ لینا اُن کی بقا اور ترقی کے لئے مضر تھا چنانچہ نریم مشرق، میں مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ۔

ہم کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ اپنی دینی اور دنیوی تعلیم کا انتظام کریں جو گورنمنٹ مدد دینے کو تیار ہے ہم کو اس کے ساتھ یہ کرنا چاہیے کہ تجارت و حرفت ہمارے ہاتھ میں آجائے ۔ ہم کو لازم ہے جو مسلمان نماز، روزہ حج، زکوٰۃ کا پابند نہ ہو، فرائض سے سرتابی کرتا ہو احکام خدا پر نہ چلتا ہو اس سے رشتہ محبت قطع کردیں اور اس سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اس طرح تمام قوم کی ہدایت کرکے خدا پرست بنا دیں ۔ ۔ ہمارے وہ مسلمان بھائی جو خدا رسول کے نام سے نہیں واقف ان کو خدا کا راستہ اور خدا کا پیغام اور خدا کا احکام سمجھنا چاہیے ، (مشرق۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ ع)

درحقیقت مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکال کر انہیں ترقی کے راستے پر لانے کے صرف یہی راستے رہ گئے تھے کہ وہ اعلیٰ دینی و دنیوی تعلیم حاصل کریں صنعت و حرفت کے میدان پر قبضہ کریں اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں نریم نے آخری سانس تک خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مسلمانوں مسلمانوں کی بقا اور ان کی ترقی کی کوشش جاری رکھیں

حکیم نریم کا یہ اخبار اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا زبردست حامی تھا۔ اصل میں نریم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں اردو ہی کا سکہ چلتا تھا چنانچہ تھوڑی کوشش کے بعد حکیم نریم خود ایک اچھے انشا پرداز اور ادیب ہوگئے اور ان کا اخبار (مشرق، مختلف النوع ادب پاروں سے بھرا رہتا ان میں غزل، قصیدہ، انشائیہ، ادبی مباحث، تبصرے اور تنقید سبھی کچھ شامل ہے۔ حکیم نریم کو تبصرے سے بہت دلچسپی تھی۔ (مشرق) کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں کسی کتاب پر تبصرہ نہ ملتا ہو۔ بعض مرتبہ تو ایک ہی شمارہ میں پانچ پانچ کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے

'پھول بن' کا تنقیدی جائزہ

از

ڈاکٹر احمد علی شکیل، سردار پٹیل کالج، سکندرآباد

ابن نشاطی کا پورا نام شیخ المشائخ محمد مظہر ابن فخر الدین ابن نشاطی تھا۔ اپنی مثنوی 'پھول بن' میں اس نے 'در صفت بادشاہ' کے عنوان سے جو شعر لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے ۔

شہاں کا شاہ عبداللہ غازی
اچھو ہم حق سوں اس کو پیش بازی

ابن نشاطی کے حالات زندگی ہنوز پردہ خفا میں ہیں اور ہماری دسترس سے باہر۔ اپنی مثنوی 'پھول بن' کو اس نے ۱۰۷۶ھ بمطابق ۱۶۶۶ع میں تصنیف کیا۔ ایک بعض محققین نے 'پھول بن' کا سن تصنیف ۱۰۶۶ھ لکھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے

'اس کی تصنیف ۱۰۶۶ھ میں ہوئی۔ ابن نشاطی نے صراحت کی ہے کہ اس کو تین ماہ کی مدت میں پورا کیا '[1]

ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے۔

'۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ع) میں اس نے ایک عشقیہ مثنوی 'پھول بن' فارسی قصے کی بنیاد پر اُردو میں نظم کی ہے '[2]

اپنے ایک تحقیقی مضمون میں محمد معین الدین یوں رقمطراز ہیں:

'قطب مشتری ۱۰۱۸ھ اور 'پھول بن' کا ۱۰۶۶ھ اس طرح ان کے درمیان

---

۱ دکن میں اُردو - نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۲۹، سن ۱۹۶۳ع

۲ شعرائے اُردو کے تذکرے - حنیف نقوی، ص ۱۰۷، سن ۱۹۷۶ع

۶۸ برس کی خلیج حائل ہے ۔[۱]

ڈاکٹر اشرف رفیع نے بھی (پھول بن) کا سن تصنیف ۱۰۶۶ ھ مطابق ۱۶۵۵ ع بتلایا ہے ۔ اپنی تصنیف کے سن کے بارے میں خود شاعر نے یوں وضاحت کی ہے :

انہا تاریخ تو لایا یہ گفتار اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار

۱۰۶۶ ھ

(پھول بن) کے جواب میں لکھی گئی سید احمد ہنر کی مثنوی (بیہ دربن) کے اشعار سے بھی (پھول بن) کا سن تصنیف ۱۰۶۶ ھ قرار پاتا ہے ۔ ہنر لکھتا ہے ؎

ہوا تیار جس دیساں میں پھلبن مصنف نے لکھا مجرند کے یو سن
سن ہجری اپے آیا جب تو رکھ یار اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار

۱۰۶۶ ھ

مندرجہ بالا اشعار سے اس بات کی کھلی وضاحت ہوجاتی ہے کہ (پھول بن) سن ۱۰۶۶ ہجری میں لکھی گئی

ابن نشاطی کی ولادت اور خاندان کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا لیکن اس کی تعلیم و تربیت کے بارے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تعلیم ایک معیار پر رہی ہوگی ۔ علوم مروجہ کے علاوہ شاعری اور اس کے محاسن پر یقیناً وہ ایک کامل استاد تھا فارسی زبان و ادب پر بھی اس کی بہتر گرفت تھی ذیل کے اشعار سے کسی حد تک اس کی لیاقت کی تصدیق ہوجاتی ہے ؎

تجھے ہے فارسی میں دستگاہ آج نہ کرتے ترجمہ بھی کوئی تج باج
تجھے معلوم ہے سارے صنائع نکو اوقات کر توں اپنا ضائع

ہمارے اس بیان کی تائید میں مختلف محققین نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے ۔

---

۱ وجہی اور ابن نشاطی کے اسالیب کا موازنہ۔ محمد معین الدین، ص ۱۲ ، ماہنامہ سب رس مئی ۱۹۴۶ ع

نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں "شاعری میں کس سے تلمذ حاصل تھا ان باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے" [1]

آغا محمد باقر لکھتے ہیں "یہ اُس دور کے مشہور شاعر ہیں۔ حالات زندگی معلوم نہیں ہوتے" [2]

یوں تو ہمیں دکنی کے جتنے بھی محققین ہیں اُن سبھوں نے ابن نشاطی کے بارے میں کھلا اعتراف کیا ہے کہ وہ اس کے زندگی کے حالات سے ناواقف ہیں لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ گولکنڈہ کا شاعر تھا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد ۱۰۳۵ ھ تا ۱۰۸۳ ہجری میں موجود تھا۔ لیکن بعض محققین نے اسے عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر لکھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے۔

"خود اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا معزز عہدے دار تھا" [3]

ڈاکٹر زور نے اسی بات کا یوں اظہار کیا ہے۔

"ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کا شاعر ہے۔ رستمی بیجاپوری کی طرح یہ بھی دربار شاہی سے غالباً بحیثیت منصب وابستہ تھا اور شخصیت کسی طرح گمنام نہیں تھی۔" [4]

ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں

"اس مثنوی کے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ دربار کی بہ نسبت عوام میں زیادہ مقبول رہا" [5]

---

۱ دکن میں اُردو - نصیر الدین ہاشمی ص ۱۲۹، سن ۱۹۶۳ ع
۲ تاریخ نظم و نثر اُردو - آغا محمد باقر، ص ۵۷-۵۸، سن ۱۹۳۳ ع
۳ دکن میں اُردو - نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۲۹، سن ۱۹۶۳ ع
۴ ابن نشاطی اور پھول بن - ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۶۹، مجلہ مکتب حیدرآباد، جولائی ۱۹۲۹ ع
۵ شعرائے اُردو کے تذکرے - ڈاکٹر حنیف نقوی، ص ۱۰۷، سن ۱۹۷۶ ع

یہ سچ ہے کہ ابن نشاطی عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں موجود تھا لیکن اس کو قطعی طور پر درباری شاعر کہنا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا حنیف نقوی صاحب کی رائے زیادہ قرین قیاس نہیں ہے قرین انصاف نہیں کہ ابن نشاطی ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے دربار سے زیادہ عوام سے قبول عام کی سند حاصل کرتا رہا ہوگا یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی مثنوی (پھول بن) میں عبداللہ قطب شاہ کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن اس بات سے یہ استنباط نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ رہا

ابن نشاطی کے حالات زندگی کی طرح اس کے ہم عصر شعرا میں بھی سوائے غواصی وجہی اور نصرتی کے کسی اور کا پتہ نہیں چلتا۔ یہاں اس بات کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ ابن نشاطی کے ہم عصر شعراء میں کوئی بھی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے قدآور نہیں کہا جاسکتا سب کے سب اپنے عہد کے بلند پایہ شاعر رہے ہیں اور خود ابن نشاطی بھی ان سب کا ہم پلہ شاعر ضرور ہے۔ اور کسی اعتبار سے بھی اس کی ادبی قامت غواصی، وجہی اور نصرتی سے کم نہیں۔

اس مثنوی کی تصنیف کے سن کی طرح تعداد ابیات کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے کسی بھی مخطوطے یا مطبوعہ نسخے میں ابیات کی تعداد ایک جیسی نہیں ہے۔ اور یہ بات سخت اُلجھن کا باعث رہی (پھول بن) اپنے عہد کی ایک نہایت مشہور تصنیف رہی ہوگی جسکا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بہت سارے مخطوطات نہ صرف ہندوستان کے مختلف کتب خانوں بلکہ انڈیا آفس لائبریری اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں بھی موجود ہیں خود حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں کئی ایک نسخے دستیاب ہیں اس کے علاوہ پھول بن چھپ بھی چکی ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں مجلس اشاعت دکنی مخطوطات نے شائع کیا جس کی ترتیب و تدوین پروفیسر عبدالقادر سروری نے کی تھی۔ اسکے بعد دکنی کے محقق شیخ چاند نے ۱۹۵۵ء میں پاکستان سے شائع کیا یہ نسخہ باوجود کوشش کے ہماری رسائی سے باہر رہا۔ جناب دیوی سنگھ چوہان نے پھول بن کو ہندی میں مرتب کر کے ۱۹۶۶ء میں مہاراشٹرا راشٹر بھاشا پونا سے شائع کروایا۔ اس

کے بعد جامعہ عثمانیہ کے ایک اور استاد جناب اکبر الدین صدیقی نے ۱۹۷۸ء میں ترقی اُردو بورڈ دہلی سے شائع کیا۔ پروفیسر سروری اور جناب اکبر الدین صدیقی کی مطبوعہ کتابوں میں اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۹۷۷ ہے جبکہ اس کے لامیہ اشعار کی تعداد جناب سروری صاحب کے پاس ۴۷ ہے اور اکبر الدین صدیقی کے پاس ۴۹ ہے۔

تعداد اشعار کے فرق کی بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس نشاطی نے مثنوی کے تعداد اشعار کے بارے میں یوں کہا ہے ؎

گنے میں آئے سو یکسار بیتاں
ہے ستر ا سو ہو دو بیس چار بیتاں
۱۷۴۴[1]

ڈاکٹر زور نے تاریخ ادب اُردو میں پھول بن کے اشعار کی تعداد ۲۵۰۰ بتائی ہے۔[2] تعداد ابیات کے بارے میں خود شاعر کی وضاحت کہ ابیات کی تعداد ۱۷۴۴ ہے اور اس بات پر شک کی کوئی گنجائش نہیں پروفیسر سروری اور اکبر الدین صدیقی کی تعداد ابیات کے بارے میں یہ تحقیق ہے کہ (پھول بن) کے اشعار کی تعداد ۱۹۷۷ ہے محققین اور شاعر کی صراحت کے بعد ۲۳۳ زائد اشعار کو کس کی جھولی میں ڈال دیا جائے یا تو یہ زائد اشعار الحاقی ہیں یا صحیح صورت اُس وقت واضح ہوسکیگی جبکہ مثنوی (پھول بن) کے سارے دستیاب نسخوں کے تقابل کے بعد مثنوی کی نئے سرے سے تنقیدی تدوین کی جائے یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ مثنوی کے ابیات کی تعداد میں اختلاف خود مثنوی پھول بن کی بہت زیادہ مقبولیت کا غماز ہے

اس کے قلمی نسخوں کی کثرت بھی ہمارے اس خیال کو تقویت بخشتے ہیں۔ اب رہ جاتی ہے زور صاحب کی تحقیق کی بات کہ (پھول بن) کے ابیات کی تعداد

---

۱ (پھول بن) مرتبہ اکبر الدین صدیقی، ص ۱۸۴، شعر نمبر ۱۹۷۱، سن ۱۹۷۸ء
۲ تاریخ ادب اُردو، ص ۳۹، سن ۱۹۸۶ء

٣٥٠٠ ہے، سراسر بے بنیاد ہے اور اس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا اس وجہ سے کہ یہ تعداد ابیات دوگنے سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے جو ظاہر قیاس اور اندازے پر مبنی ہے ایک اور جگہ ڈاکٹر زور نے یوں تحریر کیا ہے

"١٦٥٥ء میں تین ماہ میں سترہ سو شعر لکھ کر اس کو مکمل کردیا۔"[1]

دو مختلف جگہوں پر تعداد ابیات کے بارے میں اس طرح کے متضاد بیانات ہماری فہم سے بالاتر ہیں

مثنوی "پھول بن" کا قصہ صرف ایک یا دو بار کی قرأت سے اپنے پیچیدہ اور قصہ در قصہ ہونے کے سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ دکنی کے سب ہی محققین اس بات سے متفق معلوم ہوتے ہیں کہ اس مثنوی کا قصہ ایک قصہ در قصہ داستان ہے۔ لیکن یہ بات کچھ زیادہ قرین قیاس اور مبنی بر انصاف نہیں معلوم ہوتی دراصل ابن نشاطی نے "پھول بن" کے تدریجی ارتقا کیلئے مختلف قصوں اور کرداروں کا سہارا لیا ہے اور کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے "پھول بن" کا قصہ دراصل ایک داستانی انداز اختیار کئے ہوتے ہے اور مختلف جگہوں پر مافوق الفطرت عناصر کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس میں روایتی داستانی انداز کے شہر، باغ، جنگل، محل اور طلسماتی انداز کے گل و بلبل، راھب زاہد پارسا، پری، طوطا مچھلی، پریاں، طلسماتی انگوٹھی اور نقل روح کا منتر سب کچھ موجود ہے۔ قصے کا پلاٹ اس حد تک مجہول ہے کہ اکثر قاری اس کو قصہ در قصہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں

بادشاہوں اور وزیروں کی کثرت اور ناموں کی عدم موجودگی قاری کو اُلجھن میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ کہانی میں زیادہ جھول اس مرحلے پر محسوس ہوتا ہے جب بادشاہ مصر اپنے گمشدہ بیٹے ہمایوں فال کے زندہ رہنے کی خبر پاتا ہے۔ وہ بادشاہ سند سے جنگ میں فتح یاب بھی ہوتا ہے اور اسے اپنے گمشدہ بیٹے کی کسی جزیرہ میں موجودگی کا پتہ بھی چل جاتا ہے لیکن بجائے اس کے کہ وہ سیدھا اپنے بیٹے کے یہاں جاتا اس کا اپنا واپس جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

---

١ ابن نشاطی اور "پھول بن" از ڈاکٹر زور، ص ٤٠، مجلہ مکتبہ حیدر آباد، جولائی ١٩٢٩ء

راقم الحروف نے نہایت حزم و احتیاط سے غور مطالعہ کے بعد قصے کے خلاصہ کو قلمبند کیا ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر بھی ہمیں محققین کرام کی عجیب انداز میں اختلاف رائے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بارے میں تفصیل وضاحتیں پیش کی جاتی ہیں

آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

"اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایتیں بھی ہیں اور قصہ عشق و عاشقی میں انسانوں کا جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ شاید فسانۂ عجائب اسی کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔"[1]

یہ مقام تعجب ہے کہ آغا محمد باقر نے نہ تو مثنوی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی اس کے قصے کو غور سے ملاحظہ کیا پھر یہ کہنا کہ "پھول بن" میں "سکندر اور لقمان" کی حکایتیں ہیں دور دور تک صداقت پر مبنی نہیں۔ مثنوی میں کسی مرحلہ پر نہ تو لقمان کا پتہ ہے اور نہ ہی سکندر کا ان کی حکایتوں کا بیان کرنا تو دور کی بات ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قصے میں چھ مرحلوں پر نقل روح کا بیان ہے کہ جہاں بادشاہ کی روح کا ہرن کے قالب میں آجانا وزیر کا نقل روح کرکے بعد بادشاہ کے روپ میں آجانا، حسن کے سوداگر کے بیٹے کا نقل روح کے بعد بلبل کے قالب میں آجانا، زاہد پارسا کی بیٹی کا نقل روح کرتے ہوئے گل کا روپ اختیار کرنا بادشاہ کا ہرن کے قالب میں نقل روح کرنا اور ہرن سے نقل روح کرتے ہوئے طوطے کا روپ دھار لینا اور وزیر کا بادشاہ کے روپ سے نقل روح کرتے ہوئے قمری کا روپ اختیار کرنا مگر ان چھ مرحلوں کے نقل روح کا کہیں کوئی اور بیان نہیں اور ہماری فہم میں یہ باتیں یقیناً مافوق الفطرت عناصر سے تعلق رکھتی ہیں اور ابن نشاطی نے ان کا سہارا لیا ہے یہ کہنا کہ بعد کے دور میں ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کو دیکھ کر فسانۂ عجائب لکھی گئی سوائے قیاس آرائی اور زیب داستان کے کچھ اور نہیں ہے۔

عظیم الحق جنیدی لکھتے ہیں۔

۱ تاریخ نظم و نثر اُردو، ص ۵۷-۵۸، ۱۹۲۳ ع

"پھول بن" ان کی مشہور مثنوی ہے جس میں تصوف کے مسائل مختلف قصوں کی شکل میں نظم ہوئے ہیں۔ یہ اس دور کی مثنویوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اس زمانے کے رسم و رواج کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔"[1]

جناب عظیم الحق جنیدی نے دو باتوں کا اظہار فرمایا ہے ایک تو یہ کہ اس شاعر نے "تصوف کے مسائل" بیان کیے ہیں اور دوسرے اُس عہد کے رسم و رواج کو اس شاعر نے "پھول بن" میں واضح کیا ہے۔ راقم الحروف ان دونوں باتوں کی نفی کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی "پھول بن" میں نہ تو کسی تصوف کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نہ ہی اس شاعر نے اپنے عہد کے رسم و رواج کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ پوری مثنوی میں کسی مرحلہ پر کسی مقام کے یا تو سماجی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے اور نہ ہی مثنوی کا قصہ کسی تقریب کے مرحلہ سے گذرا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کئی مرحلوں پر اس شاعر نے خوب سے خوب تر منظر نگاری کی ہے مگر اس منظر نگاری کے بات کو تہذیبی اور ثقافتی عناصر کی نمائندگی سمجھنا، کچھ صحیح نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"زبان و بیان کے لحاظ سے یہ نہایت قابل قدر مثنوی ہے، رسوم و طرز معاشرت کو جابجا بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔"[2]

راقم کو ڈاکٹر صاحب موصوف کے محولہ بالا بیان کے ابتدائی حصہ سے تو اتفاق ہے کہ مثنوی "پھول بن" زبان و بیان کے لحاظ سے ایک قابل قدر مثنوی ہے لیکن یہ کہنا کہ رسوم و طرز معاشرت کو جابجا بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے سراسر بے بنیاد بات معلوم ہوتی ہے اس وجہ سے کہ اس شاعر نے رسوم و معاشرت کی کوئی بات ہی نہیں کی ہے

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنی مختلف تصانیف اور مضامین میں اس شاعر اور "پھول بن" کے بارے میں یوں اظہار کیا ہے،

---

۱ اُردو ادب کی تاریخ، ص ۶۱، ۱۹۹۰ء

۲ مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۴۱، ۱۹۸۴ء

«جہاں تک زبان کی سادگی اور اُردو دانی کا تعلق ہے "پھول بن" کا پایہ نصرتی بیجاپوری کی کتابوں سے بڑھا ہوا ہے لیکن تخیل اور انداز بیان کے اعتبار سے وہ نصرتی کی کتابوں سے کم درجہ کی کتاب ہے. بہرحال قطب شاہی دور کی ایک اچھی تصنیف ہے.»[1]

ڈاکٹر زور نے دکن کے سب سے بلند پایہ شاعر نصرتی بیجاپوری اور ابن نشاطی کا صرف دو تین جملوں میں تقابلی جائزہ لیا ہے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر زور جیسے بلند پایہ محقق کیلئے اس طرح کی باتیں مناسب ہوں لیکن صرف دو جملوں میں دو بلند پایہ شعراء کے بارے میں اس طرح کی رائے زنی شاید دعویٰ بلا دلیل سمجھی جائیگی.

اپنے ایک تحقیقی مضمون میں ڈاکٹر زور نے یوں تحریر فرمایا ہے

«تقاریب اور شادی کی رسومات کے جو بیانات اس میں پیش کئے گئے ہیں بالکل نیچرل اور حیات انسانی کے بالکل مطابق ہیں وہ سلطنت قطب شاہیہ کی معاشرت اور رسم و رواج کی اعلیٰ تصویریں ہیں»[2]

اس بیان سے یکسر اتفاق نہیں کیا جاسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ "پھول بن" کے کسی ایک بھی شعر سے نا تو قطب شاہیہ کے طرزِ معاشرت پر روشنی پڑتی ہے اور نہ ہی کسی ایک شعر میں بھی اُس عہد کے رسم و رواج پر روشنی ڈالی گئی ہے. اُسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں

«ایک طرف بادشاہ نے اس کو شاہانہ شان سرفراز کیا تو دوسری جانب موضوع کتاب کے افسانہ طرزِ بیان نے پبلک کو بھی اس کا گرویدہ بنا لیا.»[3]

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بھی صرف قیاس پر مبنی ہے اور حقیقت سے بعید ہے یہ صحیح ہے کہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب شاہ کا عہد پایا تھا لیکن دربار سے اس کی وابستگی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اپنی مثنوی کے آخری مرحلہ

---

۱ تاریخ ادب اُردو، ص ۳۹-۳۸، ۱۹۸۶ ع

۲ ابن نشاطی اور "پھول بن" از ڈاکٹر زور، مجلہ مکتبہ حیدرآباد، ص ۴۰، جولائی ۱۹۲۹ ع ۳ ایضاً

پر وہ عوام سے انصاف کا طلبگار ہے اور اُمیدوار بھی۔ اگر اسے دربار اور عوام سے مقبولیت کی سند ملی ہوتی تو وہ اپنے متقدمین شعرا سے یوں انصاف کا طلبگار نہ ہوتا۔

"نہیں وہ کیا کروں مشہور استاد — کہ دیتا شاعری کا کچ مرا داد
اچھے صد حیف جو نئیں سید محمود — کتے پاس کوں پانی دود کوں دود
نہیں اس وقت پر وو شیخ احمد — سخن کا دیکھتے نادیا سو منھ سد
حسن شوقی اگر ہوتا الحال — ہزاراں بھیجتا رحمت منجہ اپر ال
اچھے تو دیکھتا مُلا خیالی — یو میں برتا ہوں سو صاحب کمالی"[1]

اس مضمون میں ڈاکٹر زور یوں وضاحت کرتے ہیں:

"اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ قلعہ سدھوٹ میں ایک دولت مند جاگیردار تھی جو معہ اپنے شوہر دوسرے اراکین خاندان (جن کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے) ادبیات سے بے حد لگاؤ رکھتی تھی وہ ابن نشاطی کی تصنیف سے بہت محظوظ ہوئی اور چاہا کہ اس کو عمدہ تصویر کے ساتھ نقل کر دیا جائے اس نے شادی کے بیان کو زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنے کا حکم دیا"[2]

اِس طرح کی قیاس آرائی زور صاحب کی طبع زاد معلوم ہوتی ہے جو زیب داستان کی خاطر تحریر کر دی گئی ہے اس میں صداقت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

ابن نشاطی کی مثنوی کو ایک طرح سے مختصر مثنویوں میں گنا جائیگا گذشتہ اوراق میں تعداد اشعار کے بارے میں وضاحتیں کردی گئی ہیں۔ ابن نشاطی نے خود اس مثنوی کو فارسی کی مثنوی "بساتین" سے ترجمہ کرنے کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے:

"بساتیں جو حکایت فارسی ہے — عجب دیکھنے کی آرسی ہے
تجے ہے فارسی میں دستگاہ آج — نہ کرے ترجمہ بھی کوئی تحفہ باج
اسے ہر کس کے نئیں سمجھا کوں بول — دکھن کی بات سوں سرپاں کو کہہ کھول"

---

۱ "پھول بن" مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، ص ۱۶۳، ۱۹۷۸ع

۲ ابن نشاطی اور "پھول بن" از ڈاکٹر زور مجلہ مکتبہ حیدر آباد، ص ۷۰، جولائی ۱۹۲۹ع

اُردوئے قدیم کے مصنف مولوی شمس اللہ قادری نے بساتین کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"بساتین فارسی کی ایک مشہور کتاب ہے اور مُلا احمد زبیری نے اسے محمد تغلق ٧٢٥ھ - ٧٥٢ھ کے زمانے میں تصنیف کیا"[1]

باوجود تلاش بسیار کے ساتھ ہمیں دستیاب نہ ہوسکی۔

زبان و بیان کے لحاظ سے "پھول بن" ایک بلند پایا مثنوی ہے جہاں صنائع لفظی و معنوی اور محاورات کا جابجا استعمال ہوا ہے۔ زبان میں سلاست، روانی کے ساتھ ساتھ فارسی الفاظ کی آمیزش نے مثنوی کو پرکشش بنا دیا ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اگرچہ کہ مروجہ دکنی کا اثر مثنوی کی زبان پر زیادہ ہے لیکن فارسی تراکیب کے علاوہ زبان پر ہندی کی چھاپ بھی موجود ہے خصوصاً منظر نگاری اور مرقع نگاری میں ابن نشاطی نے قطب شاہیہ کے تمدن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اظہار و ابلاغ میں سلاست روانی ہر مرحلہ پر موجود ہے اکثر مرحلوں پر ابن نشاطی کی سادگی و پرکاری اپنے معیار پر ہے۔ ابن نشاطی کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس نے صنائع و بدائع کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ ان میں صنائع لفظی و صنائع معنوی نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں بالمیجانات کی پیش کش میں بھی ابن نشاطی کے یہاں ایک ندرت ہے تشبیہ و استعارہ کے بیان میں ایک بانکپن ہے خود مقول شاعر "پھول بن" میں اس نے اُنتالیس صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے۔

وہی سمجے سمج ہے جس کوں کچ بات | جو میں باندیا ہوں یو صنعت سو ابیات
بہر کوئی نہیں دکھائے سو دکھایا | صنائع ایک کم چالیس لایا

غرض "پھول بن" دکنی شاعری کی ایک ایسی مثنوی ہے جس کی ادبی حیثیت مسلم ہے اور ابن نشاطی دکنی شاعری کا روشن مینار ہے۔

• • •

---

[1] اُردوئے قدیم، ص ٦٠ - ٦١، ١٩٢٥ء

کتابی دنیا

(حدیثِ دار)

(مصنفہ ۔ منصور الدین قریشی)

تبصرہ از

جناب انور ظہیر، بڑودہ

•

ہر عہد کی اپنی قدریں اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو بتدریج بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں قدروں اور تقاضوں کی تغیر پذیری ایک طرف تو رجحانات و میلانات کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے اور دوسری طرف سیاسی و سماجی حالات اور فکری و تخلیقی عمل کا تعین بھی کرتی ہے۔ اس روشنی میں تغیر و تبدل کا پرتو نہ صرف موضوعاتی سطح پر ہی نظر آتا ہے بلکہ اس کی جھلک ہیئتی سانچوں میں بھی بہت نمایاں اور واضح ہوکر سامنے آتی ہے

غزل بلاشبہ اردو شاعری کی سب سے نمایاں اور سب سے مقبول صنفِ سخن رہی ہے۔ اردو شاعری کے اس طویل سفر میں، یعنی از آغاز تا حال، ہمیں غزل کے ساتھ مثنوی، قصیدے اور مرثیے وغیرہ بھی نظر آتے ہیں مگر چوں کہ یہ اصناف مخصوص عہد اور مخصوص مزاج کی پیداوار تھیں اس لیے اپنے عہد کے ساتھ ہی رہ گئیں اس کے برخلاف غزل نے ہر دور میں خود کو زندہ رکھا گو اس پر مصائب و ابتلا کا سایہ بھی پڑا تاہم کوئی بھی صنفِ سخن ایک عرصے تک اپنی مقبولیت قائم رکھے تو یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں زمانے کے تغیرات و انقلابات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی

ہے اور بلامبالغہ یہ صلاحیت غزل میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور اس کی ایک نمایاں مثال پروفیسر منصور الدین قریشی منصور کی (حدیثِ دار) کی غزلیں ہیں۔

منصور صاحب کی غزلوں کا امتیازی وصف وہ کلاسیکی رچاؤ ہے جس سے انہوں نے اپنی غزلوں کے تانے بانے بنے ہیں کلاسیکی شاعری کے رموز و نکات پر نہ صرف ان کی گہری نگاہ ہے بلکہ انہوں نے کلاسیکیت کو وسیع القلبی کے ساتھ قبول بھی کیا ہے اور درحقیقت غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حسن و عشق کے حادثوں میں معاملاتِ عشق کی کیفیتوں کو منصور صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیاں اور اپنے منفرد اسلوب و لہجہ کے ذریعہ مختلف رنگوں سے ہم آغوش کیا ہے لیکن عشق ان کے یہاں لذت و انبساط کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی حد و جہد میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کا وسیلہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں احساس تلذذ اور ذہنی عیش کے بجائے تصور عشق کا سچا احساس اور جذبۂ محبت کا خلوص آمیز پرتو دکھائی دیتا ہے یہاں احساسِ نشاط ہے لیکن ابتذالیت نہیں، حسن پرستی اور مسرت و لطف اندوزی ہے لیکن بوالہوسی نہیں ہے

دلوں کو حسن نے حسینوں کے کرلیا تسخیر
پھر اس کے سامنے دیوانے رنگ و بو کیا ہے

اس کے حملوں کو کیا زیست میں پسپا تو نے
تیرے آگے غم جاناں، غم دوراں کیا ہے

ہو گئی غم جاناں کی جو رگ رگ میں سرایت
تب ہی غم دوراں کی دوا ہوکے رہے گی

عجب دام تجھ میں پھنسے ہم دیکھ کر تجھ کو
کہ گزری عمر لیکن آج تک اس سے نہ ہم نکلے

اس ضمن میں پروفیسر عنوان چشتی کا خیال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے، کہتے ہیں

(مجھے کہنے دیجیے کہ حدیثِ دار کی غزلیں کلاسیکی نظم و ضبط اور

سنجیدہ خیالات کا گہوارہ ہیں۔ منصور قریشی کی شخصیت میں جو سادگی، اخلاص اور انسانی دردمندی کے جوہر ہیں وہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔

اساتذہ کی زمین میں شعر کہنا بہت مشکل امر ہے اور اس کو نباہ لے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ فنکاری یہ ہے کہ اساتذہ کی زمینوں کو اختیار کرکے اسے اپنا بنا لیا جائے اس عمل میں لغزشوں کے امکانات بھی بہت ہیں اور یہ جیرت کی بات بھی نہیں اس لیے ناقابل گرفت بھی ہے۔ منصور صاحب کی اسے جرات مندی کہیے کہ انھوں نے اساتذہ کی مشکل ترین زمینوں سے نہ صرف استفادہ ہی کیا ہے بلکہ اس کے انتخاب میں بڑی فنکاری اور اس کے استعمال میں بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کی یہ عملی کوششیں نہ صرف زبان پر ان کی قدرت کا ہی احساس دلاتی ہیں بلکہ ان کی فکری بلندپروازی کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔

جو چمن پہ منصفانہ اثر بہار ہوتا
تو ہر اک کنول میں گل سے کبھی کم نہ خار ہوتا

(یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا) غالب

گو وہ کہے کہ مانگ لو دوں گا میں کل جہاں، مگر
میری خودی سخت کوش، دست طلب بڑھائے کیوں

(موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں) غالب

چوری جو چھپانا ہو تو بے باک نظر ہو
دزدیدہ نگاہی سے تو ہوتی ہے عیاں اور

(کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور) غالب

وہ تو مائل ہے عطا دینے کو سب کچھ لیکن
کیا کروں دست طلب مجھ سے بڑھائے نہ بنے

(نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے) غالب

داوں کو جس نے حسینوں کے کرلیا تسخیر
پھر اس کے سامنے دنیائے رنگ و بو کیا ہے

(ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے) غالب

ہم نے منصور حق پرستوں کو
جب بھی مارا ہے دار نے مارا
(اور جگر کو شراب نے مارا) جگر

مدت ہوئی ہم چھوٹ لیے ہیں گو قید قفس سے
حسرت سے پر آتا ہے وہی دورِ جفا یاد
(اب کچھ بھی نہیں مجھ کو قفس کے سوا یاد) جگر

ہم وضع دار ہو وہ عاشق افسدار جدید
دو قدم پھر کس لئے ہم سے نہ گریزاں ہوں گے
(ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے) مومن

ان اشعار کے مدنظر منصور صاحب کے ادبی رجحان اور ان کے مطالعہ سے متعلق اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے اور صرف کلاسیکی شاعری سے ہی لگاؤ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ جدید شاعری پر بھی گہری نگاہ اور ان کے عمیق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے

اردو شاعری میں میر و مرزا کے افکار و خیالات سے استفادے کا رجحان ہر دور میں غالب رہا ہے اور ہر دو شعرا کی شعری و فکری روایت ہر زمانے میں اہم اور غیر اہم شعرا و ادبا کی توجہ کا مرکز رہی ہے منصور صاحب نے اگرچہ اردو کے قدیم و جدید شعری و ادبی سرمائے سے فیض اٹھایا ہے لیکن غالب کے فکر و فن کی چھاپ نسبتاً زیادہ نمایاں ہے یہی سبب ہے کہ حدیقہ دار کی کتنی ہی غزلیں غالب کی نذر کردیتی ہیں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ منصور صاحب کی غزلیں، غزلیاتِ غالب کی خوشہ چیں اور ان کا نقشِ دوم بن گئی ہیں بلکہ انہوں نے اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر اپنی جداگانہ شاعرانہ شخصیت کا احساس دلایا ہے اور اس میں بھی وہ بھرپور جمالیاتی فضا قائم کرتے ہوئے آگے بڑھے ہیں گو موضوعات کی تکرار کہیں کہیں کھلتی ہے تاہم اشعار اپنا حسن برقرار رکھتے ہیں اور زبان پر قدرت ان چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر غالب آجاتی ہے۔

پروفیسر منصور الدین قریشی منصور کے کلام میں جو دروں بینی اور اثر آفرینی

ہے اس کا اہم سبب یہی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے خارجی حالات کو اپنی ذات و فکر سے ہم آہنگ کیا ہے ایک انسان دوست شاعر کی حیثیت سے منصور صاحب نے حدیث دار میں اپنے تاثرات پیش کیے ہیں، اور یہ ان کا احساس جمال ہی ہے جو ان کو انسان دوستی کی منزلوں تک لاتا ہے ایک حساس شاعر ہونے کے سبب ان کی نگاہیں سماجی و عائلی زندگی پر بھی مرکوز ہوتی ہیں وہ عصری حالات اور غم حیات کی کشاکش سے بے خبر نہیں رہتے ہیں چنانچہ انہوں نے اخلاق و محبت، اخلاص و ایثار، سیاسی و معاشی شر انگیزی و بد حالی پر انسان دوستی ایسے موضوعات کو سیدھے سادے الفاظ کے ذریعہ عام لوگوں کے دلوں تک پہنچا دیا ہے اس لحاظ سے غور کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری مشاہدات و محسوسات کی شاعری ہے شوق ماہری اپنے تبصرہ میں رقم طراز ہیں:

"ان کے مزاج میں بڑی انکساری، گفتگو میں شیرینی اور نرمی ہے یہی انکسار، معصومیت اور خلوص شاعر کی طبیعت میں چھپے ہوئے بڑے پن کو ظاہر کرتا ہے منصور صاحب اپنے عہد، ماحول اور ذاتی مشاہدات سے حاصل کردہ کیفیات کا بھرپور شعور و ادراک رکھتے ہیں . . . وہ اپنے رات دن کے عینی مشاہدات کو نہایت محتاط انداز میں شگفتہ قلمی کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں یہی اخلاقی و تہذیبی احتیاط اور ٹھہراو ان کی شاعری کی خصوصیت بھی ہے اور حسن بھی۔"

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسی انکسار و معصومیت اور اخلاق و تہذیب کی پاسداری نے منصور صاحب کو انسانیت سازی کا شعور بخشا اور اسی لیے وہ انسانیت سوزی میں نہیں بلکہ انسانیت سازی میں یقین رکھتے ہیں جس کے ڈانڈے مذہبی سرحدوں سے نکل کر انسانی حدود سے جاملتے ہیں کیوں کہ ان کی نگاہ میں انسان، مذاہب سے اونچا ہے اور انسان کی توہین خالق کائنات کی توہین ہے۔ اور دراصل یہی ان کی زندگی کا سچا احساس جو ان کی زندگی میں ہے وہی ان کی غزلوں میں در آیا ہے اسی لیے ان کے یہاں اقدار حیات کی پاسداری بھی ہے اور علی الخصوص وہ قدریں بھی ہیں جن سے زندگی کو استحکام ملتا ہے اور انسان دوستی محترم قرار پاتی ہے ورنہ عصر حاضر کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اخلاقی قدریں پامال ہوتی جاتی ہیں،

انسانی زندگی دکھ درد میں مبتلا اور زندگی بے کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی جاتی ہے ۔ اور اس مقام پر منصور صاحب کی شاعری یقینی طور پر حوصلہ بخشتی ہے اور بے کیف زندگی کی تاریک راہوں میں سرور آفریں لمحوں کی شمع بن کر منزل کی رہنمائی کرتی ہے ؂

کعبے میں تیرے غیر بھی ہو جائیں گے شامل
ان کے لیے کھولے جو در دل تو ذرا سا

اہل جہاں میں کوئی تو اہل ہنر ملے
اکثر ہے جو دل کو جوڑ دے وہ شیشہ گر ملے

عقل حیران ہے اقدار کی تبدیلی پر
کل جو تھا عیب وہی آج ہنر ہے کہ نہیں

پیسے اقدار کی عصا ہو جب
کوئی پیدا کرے کمال کہاں ؟

بے طرح مجروح ہوتا ہے مرا ذوق لطیف
دیکھ کر یہ حسن کی بے باک عریانی کا حال

ان کے اشعار کے پس پشت منصور صاحب کی خود داری اور غیرت مندی کارفرما ہے اسی لیے ان کے یہاں بکھرتی ہوئی قدروں کا ماتم بھی ہے اور اپنی کم مائیگی اور بے بسی کا شدید احساس بھی ، زمانے کی ناقدری کی شکایت بھی ہے اور ترقی میں تنزلی کا عکس بھی ۔ گویا عصری مسائل اپنی انتہائی شکل میں منصور صاحب کی شاعری میں نمایاں ہیں ۔ شاید اسی جذبے کے پیش نظر سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سید حامد صاحب نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے ، کہتے ہیں ۔

' یہ (حدیث دل) ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی شہادت دے رہا ہے اور اس کا اعلان بھی کر رہا ہے کہ صاحب کلام خود دار ، غیور اور کم آمیز ہے ۔ '

اور صحیح معنوں میں یہی خود داری اور غیرت مندی ہے جو عصری زندگی کی بے ترتیبوں ، جدید تہذیب کی رنگینیوں اور ٹوٹتی بکھرتی قدروں سے مطابقت نہ

مانع ہے چنانچہ ہر اس جگہ جہاں انفرادی زندگی کی گھٹن، اجتماعی زندگی کی ناآسودگی اور اضطراری کیفیات، شخصیت کی دہلیز پر دستک دینے لگی ہیں وہیں ان کا عصری شعور بیدار ہوا ہے اور استبداد زمانہ کا احساس غزلوں کا حصہ بنا ہے ؎

دنیا میں ہر اداسی انوار ہے لیکن
ہر سمت اندھیرا یہ کرم ہے کہ ستم ہے

ہم نظر اور ہم خیال کہاں
عصر حاضر ہے حسب حال کہاں

ہے عافیت اسی میں کہ دامن بچائیں ہم
ان سے، نظر جو آتے ہیں یاں معتبر تمام

ہے چمن میں دور استبداد کیا
ہو رہے ہیں اب قفس آزاد کیا؟

منصور صاحب سمیات کے پروفیسر رہے ہیں لیکن اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور کلاسیکی ادب پر گہری نگاہ۔ خاص طور سے اردو کا شعری سرمایہ ان کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے اس وابستگی نے دراصل ان کی شعری شخصیت کی تشکیل بھی کی ہے اور جیسا کہ سطور بالا میں عرض ہوا کہ جگر، مومن، فانی کے علاوہ غالب کی شاعری سے ان کو خاص لگاؤ تھا چنانچہ اسی مطالعہ نے ان میں شعر گوئی کا حوصلہ پیدا کیا۔ حدیث دار اسی مسلسل اجتہاد و ریاضت کا ثبوت ہے لیکن شاعر موصوف نے اس کو نام و نمود کا نہیں بلکہ جذبات و احساسات کا وسیلہ بنایا اور جو کچھ بھی محسوس کیا اسے لفظوں میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے اشعار پھلانگنے کی ہمت نہیں ہوتی ایک شعر کے بعد دوسرا شعر خود قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ سلسلہ مقطع تک جاری رہتا ہے۔

منصور صاحب کی غزلوں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ ان میں حالات کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ان انسانوں کی تصویر کشی ہے جو اپنی سادہ دلی

اور معصومیت کے سبب ظلم سہتے بھی خاموش رہتے ہیں اور لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے بلکہ اسے سماجی حقیقت اور روایتی صداقت سمجھ کر زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ منصور صاحب کی شاعری نفسیاتی گھٹن کے ساتھ عصری تقاضوں اور صداقتوں کو بھی اپنے اندر جذب کرتے ہوئے رواں دواں ہے ؂

حیرت ہے کہ حق گویوں کی فہرست میں منصور
تاریخ نے تیرا ہی فقط نام دیا تھا

غم دوراں کی گراں باری ہے ایسی منصور
لاکھ چاہا کہ اٹھے سر یہ اٹھا ہی نہ سکے

ناخداؤں ہی کے ایماء سے جو اٹھے ہیں چمن
جانتے ہیں خوب ہم ان کی نگہبانی کا حال

احتجاجوں کے، سینے میں اٹھے طوفاں مگر
ہونٹ تردید زمانہ میں ہلا ہی نہ سکے

منصور سے حق گو کے بھی اب وائے زمانہ
لب ہو نہ سکے وا، یہ کرم ہے کہ ستم ہے

یہاں سماجی شعور، سیاسی شعور سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ منصور صاحب مفاد پرست اہل سیاست کے دو رخی کردار سے پوری طرح واقف و آگاہ بھی ورنہ وہ پھر یہ نہ کہتے ؂

جب نہ کچھ کام دنیا کو مجھ سے رہا
مجھ سے آنکھیں وہ کیسی چرانے لگے

لچک دار کتنا ہے دین سیاست
کہ ہر آدمی، آدمی کا خدا ہے

اس چمن کی تباہی میں اے باغباں
کیا پس پردہ تیرا اشارہ نہیں

غم گساری دنیا آج ان کا پیشہ ہے
درد کی رمق تک بھی ہے نہ جن کے سینوں میں

جانتے ہیں خوب ان کے دو رخی کردار کو
بار بار ان سے فریبِ دوستی کھائیں گے کیا؟

ان تصورات و موضوعات کے علاوہ منصور صاحب کی غزلوں میں ایک اور تصور نمایاں ہوا ہے جو فرد کی نجی زندگی اور اس کی شخصیت سے ابھرنے والی اضمحلالی کیفیت اور اداسی و بے چینی سے عبارت ہے جس میں معاشرتی گھٹن، سیاسی رسہ کشی سے پیدا شدہ بے بسی، کرب ناکی اور تنہائی کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور جو اجتماعی زندگی کی محروم تمناؤں اور اداس خواہشوں سے ہم آہنگ ہو کر اجنبیت کی صورت میں اُجاگر ہوا ہے تصور اجنبیت کا یہ سلسلہ عصر حاضر کا المیہ بن کر احساس تشکیک و عدم تحفظ سے جاملتا ہے چند اشعار پر ہی اکتفا کرتا ہوں ۔۔۔

اس شہر میں تو رہتے ہیں بے چہرہ لوگ ہی
غم کیا اگر مرا بھی تشخص یہاں نہ ہو

دور ہی دور مجھ سے رہتا ہے جو بھی یاں ہم زبان ہے پیارے

ایک موج ترحم بھی نہ جب آنکھ میں ابھری
روداد الم آپ نے پھر میری سنی کیوں

تو ہے میرا شریکِ غم تو کہیں
تجھ سے بد ظن جہاں نہ ہو جائے

فکر کا تعمق، مطالعہ کی وسعت، جذبے کا خلوص اور احساس کی شدت کی ہم آہنگی موضوعات کے تنوع کی ضامن ہوتی ہے منصور صاحب کی شاعری میں موضوعات کی بوقلمونی نہ صرف ان کی عصری آگہی کا پتہ دیتی ہے بلکہ ان کے تاریخی و سیاسی شعور اور سماجی بصیرت کی مظہر بھی ہے۔

منصور صاحب کی شعری شخصیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ

انہوں نے ایک ایسے علاقے میں اردو شاعری کو زندہ رکھا ہے جس نے اردو شاعری کے ابتدائی دور میں ایسا سکہ چلایا گو وہ آج متروک ہے اسی سے دل برداشتہ ہوکر گجرات کے ایک معتبر شاعر نے کہہ ہی دیا ہے

ہم نے گجرات کے بازار میں اردو تیرا
سکہ اس طرح چلایا ہے کہ جی جانے ہے

• • •

شعوری رجحانات

(مصنف خلیق الزماں نصرت)

تبصرہ از

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

•

'شعوری رجحانات' نصرت کے سات ادبی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ ان مقالوں کے عنوانات ہیں، پیش رس، عصری غزل میں حالات حاضرہ، علامہ اقبال کے کلام کی پیش گوئیاں، وصفی نظام پوری۔ شخصیت اور فن، سوکھے جزیرے کی دعا، یوسف جمال کے شعری مجموعہ کا ایک مطالعہ، امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری، حاصل مطالعہ، اردو وادی حار میں

ابتدا میں ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کا پیش لفظ ہے جس میں انہوں نے مختصراً نصرت کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد ایک ایک کرکے اُن کے مقالات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اُن کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد 'خلیق الزماں نصرت کا ادبی شعور' کے نام سے محمد رفیع

انصاری کا مضمون ہے جس میں انہوں نے نصرت کی شاعری اور تنقید نگاری کا پس منظر بیان کرنے کے بعد اُن کی ادبی صلاحیتوں کو سراہا ہے اور ڈاکٹر نعمانی کی طرح انہوں نے بھی اس مجموعہ میں شامل نصرت کے بعض مقالات کی خوبیاں بیان کی ہیں

پھر خود خلیق الزماں نصرت نے (پیش رس) کے نام سے اپنے حالات زندگی نسبتاً تفصیل سے بیان کئے ہیں اور زبانوں کو آسمانی، سلطانی اور عوامی کے نام سے تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کی وضاحت کی ہے اور اردو کو عوامی زبانوں میں سب سے ممتاز قرار دیا ہے

بحیثیت مجموعی کتاب کافی معلوماتی ہے اور اس کے مضامین میں آج کے شعری، ادبی اور تنقیدی رجحانات کو بڑی خوبی سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے چونکہ نصرت کا تعلق بہار کے ایک علمی ادبی خاندان سے ہے اس لئے زبان و بیان کی خوبیاں انہیں ورثہ میں ملی ہیں پھر ان کے دائمی مطالعہ اور مشاہدہ نے انہیں جو ادبی شعور بخشا ہے وہ کافی گہرا ہے نتیجہ یہ کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے سلیقہ سے لکھا ہے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

• • •

Edited by Prof Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam's Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Published by Mr Abdul Majeed Patka, B Com (Hons)
General Secretary
Anjuman i-Islam Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008

مقالات

اسلامیات

آفاق احمد صدیقی

اسلام میں عورت کا مقام
دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے پس منظر میں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، جولائی ۱۹۹۶ع، جلد ۱۸ ، شمارہ ۷ ، ص ۵۶-۶۲)

اسلام میں عورت کے صحیح مقام کی وضاحت تہذیبی تاریخ کے پس منظر میں۔

اصلاحی طلحہ ایوب (مترجم)

عہد اسلامی میں کتبخانوں کا قیام و ارتقاء

(معارف اعظم گڑھ ، جولائی ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۸ ، شمارہ ۱ ، ص ۲۳-۴۵)

عہد اسلامی میں کتبخانوں کے قیام و ارتقاء کی تاریخ۔

بخاری سید محمد فاروق

حضرت میر سید محمد بن امیر کبیر
سید علی الہمدانی

(معارف اعظم گڑھ ، مئی ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۷ ، شمارہ ۵، ص ۳۲۵-۳۴۹)

کشمیر میں تبلیغ اسلام کے لئے انتھک محنت کرنے والے بزرگ حضرت میر سید محمد بن امیر کبیر الہمدانی کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کی تفصیلات۔

جانسی، علیم اشرف

استشراق اور اس کے محرکات و مکاتب فکر

(معارف اعظم گڑھ ، اگست ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۸ ، شمارہ ۲ ، ص ۸۵-۱۰۰)

اسلام پر مغربی مفکرین نے وقتاً فوقتاً جو کام کیا ہے اس کو اسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیا ہے۔ اور اس کی تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے۔

صدیقی، یسین مظہر

عہد نبوی میں رضاعت

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ۶، ص ۵-۴۲۵)

بعض حلقوں میں حضرت حلیمہ سعدیہ سے رسول اکرم کی رضاعت کی روایات کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ اس مضمون میں اس کا مدلل جواب ہے۔

عہد نبوی میں رضاعت

(معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۱، ص ۵-۲۲)

مذکورہ مضمون کی دوسری قسط، عرب میں رضاعت کے رواج پر مزید بحث

طیب انصاری

عہد آصفیہ میں مذہبی علوم کا فروغ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اگست ۱۹۹۶ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳، ص ۳-۴)

عہد آصفیہ میں مذہبی علوم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا تفصیلی تعارف۔

قاضی عبدالستار

دینی مدارس کا موجودہ نصاب اور عصری تقاضے

(آموزگار جلگاؤں، مئی ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۵، ص ۹-۱۴)

دینی نظام تعلیم کی تاریخی تفصیل، اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری اضافوں کی نشاندہی۔

محمد شمیم الزماں (مترجم)

انسانی حقوق کا اسلامی نظریہ
بنیادی تصور اور اظہارات

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جولائی ۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۷، ص ۴۰-۴۸)

انسانی حقوق کا اسلامی نظریہ اور اُن کی حفاظت کی ذمہ داریاں اسلامی نقطۂ نظر سے۔

محمد عتیق الرحمٰن

پس ماندہ مسلمان اور ہماری ذمہ داریاں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۹۶ع،

جلد ۱۵، شمارہ ۸، ص ۲۳-۳۹)

معاشی اور دینی اعتبار سے پس ماندہ مسلمانوں کا حال زار، اور ان کے سدھار کی دینی، تعلیمی اور معاشی ترکیبیں

منیر الدین احمد

شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اپریل ۱۹۹۶ء، جلد ۱۵، شمارہ ۴، ص ۲۶-۴۰)

ابن عربی کے حالات زندگی اور تصوف کے سلسلے میں ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ۔

ندوی، جمشید احمد

موسیٰ بن عقبہ اور ان کی مغازی

(معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۹۶ء، جلد ۱۵۸، شمارہ ۲، ص ۱۰۱-۱۱۲)

موسیٰ بن عقبہ (۱۴۱ھ) امام زہری کے شاگرد تھے اور رسول اللہ کے اہم سیرت نگار تھے، انہیں کے حالات زندگی تلاش و تفحص سے جمع کئے ہیں

ادبیات

ابو صہیب رومی

حضرت یار احمد یار بریلوی کا عربی کلام

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۶ء، جلد ۱۵۷، شمارہ ۶، ص ۴۵۳-۴۶۵)

مئی - جون ۱۹۹۵ء کے معارف میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مذکورہ بالا عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس کے جواب میں ابو صہیب رومی کے چند معروضات مارچ ۹۶ء کے معارف میں شائع ہوئے اسی سلسلہ کی ایک کڑی (داد عمل) ہے جس کی صحیح حقیقت یہاں واضح کی گئی ہے۔

اثر محمد علی

دکنی اردو میں حمدیہ شاعری

(سب رس حیدرآباد، جنوری ۱۹۹۶ء، جلد ۵۸، شمارہ ۱، ص ۲۹-۳۶)

حمدیہ شاعری کی وضاحت اور دکنی میں موجود حمدیہ شاعری کا جائزہ۔

ادارہ

اہل علم و ادب کی نظر میں بمبئی میں اردو

(ترسیل بمبئی، ستمبر ۱۹۹۶ء، شمارہ

۱۱-۱۰، ص ۱۸-۲۲)

بمبئی میں اردو اور دکھوے میموسہ دلوی کی دو تحقیقی تصانیف ہیں، اہل علم و ادب نے ان کے متعلق جن خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کی تفصیل

اکبر حیدری کشمیری

دیوان غالب کی اولین شرح « وثوق صراحت »

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم مارچ ۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۹، ص ۱ اور ۷)

محمد عبد العلی والہ کے حالات زندگی، اور ان کی تصنیف کردہ شرح غالب مسمیٰ « وثوق صراحت » کا تفصیلی تعارف

انور شمیم انور

اردو غزل پر سراج اورنگ آبادی کے اثرات

(آجکل نئی دہلی، جولائی ۱۹۹۶ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۲۰-۲۵)

سراج اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور سودا، درد، مہر، غالب، ذوق، امیر مینائی، اقبال، جگر اور دوسرے پرانے نئے شعرا پر سراج کا کتنا اثر ہے مثالوں کے ساتھ بتایا ہے ۔

بدیع الزماں

اقبال کی نظر میں تہذیبِ فرنگ

(نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۹۶ ع، جلد ۴۶، شمارہ ۱، ص ۲۵-۴۲)

مشرقی اقوام پر مغرب کے تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی یلغار کے خطروں کا تجزیہ اقبال کے کلام کی روشنی میں ۔

اقبال کے چند موضوعات کی تشریح خود اقبال کی زبانی

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ٦، ص ۴۴۴-۴۵۲)

اقبال نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ایسی سیکڑوں اصطلاحات استعمال کی ہیں، جو حسبِ ضرورت خود اقبال نے وضع کی تھیں۔ اِس میں ان اصطلاحات کی تشریح ہے ۔

جین گیان چند

ازادیات کا مطالعہ

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۶ ع، جلد ۴۶، شمارہ ۱، ص ۱-۲۴)

حکن ناتھ آزاد پر وقتاً فوقتاً جو کتابیں رسالے اور خصوصی نمبر شائع ہوتے ہیں اُن کا تنقیدی اور تاثراتی جائزہ۔

دسنوی عبدالقوی

داردو کے چند نامور ادیب اور شاعر، پر ایک نظـــر

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ع، جلد ۳۶، شمارہ ٦، ص ۴۹-۵۸)

داردو کے چند نامور ادیب اور شاعر، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسی کا یہ تفصیلی جائزہ ہے۔

ایوان اردو اور صد سالہ جشن ولادت ملا رموزی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ اپریل ۱۹۹٦ع، جلد ۵۵، شمارہ ۱۴۔ ص ۱ اور ۹)

ملا رموزی اور اُن کی نگارشات کا تعارف، جو اپنے عہد میں گلابی اردو کے لئے مشہور تھے۔

رشید حسن خاں

مثنویات شوق (منع اشاعت)

(آجکل نئی دہلی، جولائی ۱۹۹۱ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص۱۰-۱٦)

نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویات فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق، پر یا ان میں سے کسی ایک پر حکومت نے کبھی پابندی لگائی تھی یا نہیں، اس پر ایک تحقیقی بحث۔

رفاقت علی شاہد

قصہ نو رتن جہاں

اٹھارویں صدی کی نادر داستان

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ اگست ۹٦ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۲، ص ۱-۲)

داستان نو رتن جہاں کا تفصیلی تعارف۔

مثنوی رمز العشق کا ایک قلمی نسخہ

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اگست ۹٦ع، جلد ۵۵، شمارہ ۲۹، ص ۲-۳)

مثنوی رمز العشق کے مصنف غلام قادر شاہ تھے اس کا ایک قلمی نسخـــہ خلیل الرحمن داؤدی کے پاس محفوظ ہے۔ اسی مخطوطہ کی تفصیلات یہاں درج ہیں۔

رومی ابو صہیب

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کا عرفانی کلام

(معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۹٦ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۱، ص ۴٦-٦۲)

مضمون کی دوسری قسط نیاز احمد نیاز بریلوی کے عربی کلام پر تنقیدی نظر

سحر انصاری

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری

(ترسیل ممبئی، ستمبر ۱۹۹۶ء، جلد ۱۲ـ۱۱، ص ۸۸ـ۸۴)

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا ادبی اور فنی جائزہ

سید حامد

اردو زبان اور دیوناگری رسم الخط

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جولائی ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۲۶، ص ۱ـ۲)

اردو زبان کو ہندی رسم الخط میں لکھنے کے سلسلے میں علی سردار جعفری کے خیالات پر تنقید۔

سید داؤد اشرف

قدیم اور بیش قیمت مخطوطات کا تحفظ آخری آصف جاہی حکمراں کے اہم اقدامات

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جولائی ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۲۶، ص ۸)

حیدر آباد کے آصف جاہی خاندان کے چھٹے حکمراں نواب میر محبوب علی خان نے اپنے عہد میں مخطوطات کی حفاظت کا جو کام انجام دیا اس کی تفصیل۔

شاداب ذکی بدایونی

«کتابی دنیا» بدایوں کا ایک رسالہ

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم مارچ ۱۹۹۶ء، جلد ۵۵، شمارہ ۹، ص ۸)

نظامی بدایونی اور اُن کے خاندان کی ادبی خدمات کا جائزہ اور وحید الدین بدایونی کے رسالہ کتابی دنیا کا تعارف۔

علوی تنویر احمد

مرزا غالب

(ترسیل ممبئی، ستمبر ۱۹۹۶ء، شمارہ ۱۲ـ۱۱، ص ۷۷ـ۸۲)

غالب کا شعری و ادبی جائزہ۔

فاروقی شمس الرحمٰن

بنارس میں فارسی زبان و ادب کے دو قیمتی آثار

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ء، جلد ۳۶، شمارہ ۶، ص ۷ـ۱۴)

غالب کی مثنوی «چراغ دیر» اور

"ڈریمنگ آنڈ رائٹ" کا تعارف و تبصرہ۔

کاوش بدری

شہزادی انیمہ آرکاٹی کی مثنویاں

(معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۲، ص ۱۱۲ - ۱۲۳)

انیمہ آرکاٹی (مدراس) کے حالات زندگی اور اُن کی مثنویوں کا تعارف۔

نظام الدین ایس گوریکر

شبلی نعمانی کی ہمہ جہت شخصیت

(ماہنامہ ہکام پونہ، مئی جون ۱۹۹۶ ع، جلد ۱، شمارہ ۳-۴، ص ۱۵)

علامہ شبلی نعمانی کی علمی و ادبی کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ ہی نہیں ہے بلکہ انکی ہمہ جہت شخصیت کی عکاسی ہے

مرزا اکبر علی بیگ

حفیظ دہلوی - ایک تعارف

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اگست ۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۱، ص ۸)

حفیظ دہلوی کا تعارف اور ان کی شاعری کا جائزہ

میمونہ دلوی

بمبئی کے چند قدیم اردو اخبار

(ترسیل بمبئی، ستمبر ۱۹۹۶ ع، شمارہ ۱۱-۱۲، ۴۸-۶۳)

انیسویں صدی کے نصف ثانی میں شائع ہونے والے چند اردو اخبارات کا تعارف جو درج ذیل ہیں کشف الاخبار، مخبر سرور، ہدایت ہند، خادم ہند، اشتہار، انڈیا گزٹ، عالم افروز

میمونہ عبدالستار دلوی

سرزمین کوکن اور اردو لوک گیت

(ترسیل بمبئی، ستمبر ۱۹۹۶ ع، شمارہ ۱۱-۱۲، ص ۳۲-۴۷)

کوکن کے اردو لوک گیتوں کا جائزہ لوک گیتوں کے متن کے ساتھ۔

ناظم جعفری

پروین شاکر

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۲، ص ۹)

پروین شاکر کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا جائزہ۔

نقوی امام مرتضیٰ

امروہہ کے نثری مزاح نگار

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۸ جولائی ۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۲۷، ص ۲)

میر محفوظ علی بدایونی، مولوی فضل ستا لاأبالی کی مزاح نگاری کا جائزہ

شخصیات

اصلاحی، ابو سفیان

احمد لطفی سید اور ان کی علمی خدمات

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ۵. ص ۳۵۹-۳٦ـ۳)

ایک مصری عالم احمد لطفی کے حالات زندگی اور ان کی سیاسی اور علمی خدمات کا جائزہ

اصلاحی، ضیاء الدین

وفیات مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

(معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۲، ص ۱۴۴-۱۵۰)

قاضی اطہر مبارکپوری کے حالات زندگی اور ان کے علمی کارناموں کا جائزہ۔

ایوب واقف

میمونہ آپا۔ شخصیت کے چند روشن پہلو

(ترسیل بمبئی، ستمبر ۱۹۹۶ ع، شمارہ ۱۱-۱۰، ص ۱۳-۱۰)

میمونہ دلوی کی شخصیت کے کچھ روشن پہلو، سرزمین کوکن کی ایک ادیبہ کی حیثیت سے۔

دعوت

فرانس کا ایک مسلمان سائنس داں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اپریل ۹۶ ع، جلد ۱۵، شمارہ ۴، ص ۶۰-۶۱)

فرانس میں مقیم افغان نژاد سائنس داں طاہر مسعود کا تعارف، جس کا شمار فرانس کے چند اعلیٰ ترین سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔

ربہ قریشی

مولانا احمد بن سلیمان الکرد الاحمد آبادی

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ۵، ص ۳۵۰-۳۵۸)

احمـــد کرد احمد آبادی کی حالات زندگی اور ان کے مطالعہ اور علمی کاموں کا تذکرہ (دوسری قسط)

سید حامد

بدر الدین طیب جی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اپریل ۱۹۹۶ ع، جلد ۱۵، شمارہ ۴، ص ۱۹-۲۵)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلق سے بدر الدین طیب جی کی تعلیمی اور سیاسی پرورش کا ایک جائزہ

سید علی رضا

سید محمد زیدی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اگست ۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۳۱، ص ۳)

سید محمد زیدی شہر بمبئی کے ایک اچھے ادبی، سماجی اور سیاسی ورکر تھے جو ٦ جولائی ۱۹۹٦ ع کو انتقال کر گئے۔ اس میں انہیں کا تعارف ہے۔

عروان احمد

الخوارزمی ۔ ریاضی اور ہیئت کا امام

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اپریل ۹٦ ع، جلد ۵۱، شمارہ ۴، ص ۴۱-۴۲)

الخوارزمی کا مختصر سا تعارف، علم ریاضی اور علم ہیئت کے عالم کی حیثیت سے۔

متفرقات

اختر محمد محفوظ

کمپیوٹر اور اس کا تاریخی پس منظر

(آموزگار جلگاؤں، جون ۱۹۹٦ ع، جلد ۱۵، شمارہ ٦، ص ۱۵-۱۸)

کمپیوٹر کی تیکنیکی وضاحت اور اس کا تاریخی پس منظر

جائسی، سید علیم اشرف

ٹیسٹ ٹیوب بے بی یا تجرباتی طفلی زادہ

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹٦ ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ٦، ص ۴۲٦-۴۴۳)

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے تجربات کی تاریخ اور اس کی سائنسی وضاحت بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ ٹیسٹ ٹیوب علاج کی ایک قسم ہے اور اس کی جائـــز صورتـــوں کو بروئے کار لانا مشروع اور شریعت کا مطلوب ہے

ذو الفقار احمد

شری آروند گھوش، فکر اور
نظریۂ فوق البشر

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۹۶ع،
جلد ۱۵، شمارہ ۸، ص ۵۲-۵۵)

گھوش کے حالات زندگی، اور ان
کے فلسفہ کا تفصیلی تعارف

رئیس انور

کلکتہ میں علوم شرقیہ کے
ادارے۔ ۱۹ ویں صدی تک

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۶ ع، جلد
۴۶، شمارہ ۱، ص ۴۳-۶۸)

۱۹ ویں صدی تک انگریزوں نے کلکتہ
میں علوم شرقیہ کے جو ادارے قائم کئے
اُن کی تاریخی تفصیل۔

سید ساجد علی

مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ ٹونک کی خدمات

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم اور ۱۵ جون
۱۹۹۶ ع، جلد ۵۵، شمارہ ۲۲-۲۱،
ص ۲-۳)

ٹونک کے نوابوں کی علمی خدمات اور
مولانا آزاد کی ان کی کتابوں کے متعلق
تنظیمی کوششیں۔ دو قسطوں میں۔

شان محمد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور
قومی سیاست ۱۹۴۷ع تک

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جولائی ۹۶ع،
جلد ۱۵، شمارہ ۷، ص ۱۳-۱۹)

قومی سیاست میں مسلمانوں کا حصہ
اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ
طلبہ کے سیاسی کارناموں کی تفصیلات۔

شکیل الرحمٰن

بابا گرونانک۔جپ جی صاحب

(آجکل نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۶ ع، جلد
۵۵، شمارہ ۲، ص ۳-۸)

گرونانک کی پنجابی حمد جپ جی
صاحب کا جائزہ۔

صدیقی صفی الدین

وہ کتابیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا

(سب رس حیدر آباد، جنوری ۱۹۹۶ ع،
جلد ۵۸، شمارہ ۱، ص ۲۴-۲۸)

مذہب، فلسفہ، سماجیات اور ادب سے

متعلق اُن چند انگریزی کتابوں کا تذکرہ جس سے مضمون نگار متاثر ہوئے۔

صدیقی ظہیر علی

راماین کا ایک قدیم نثری مخطوطہ

(معارف اعظم گڑھ، اگست ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۸، شمارہ ۲، ص ۱۳۳-۱۳۷)

اخوند زادہ احمد خاں عملت رامپوری کا اردو نثر میں تحریر کردہ راماین کے ایک قدیم نسخہ کا تعارف جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے

تاریخ کتب خانۂ واحد۔ مخطوطہ

(کتاب نما نئی دہلی، جون ۱۹۹۶ع، جلد ۳۶، شمارہ ۶، ص ۳۲-۳۶)

رضا لائبریری رامپور کے ایک مخطوطہ تاریخ کتب خانۂ عالیہ دار الریاست مصطفیٰ آباد عرف رامپور کا تعارف جو حافظ احمد علی شوق کا مرتب کردہ ہے

محمد عمر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقامتی کردار

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جولائی ۹۶ع، جلد ۱۵، شمارہ ۷، ص ۲۰-۳۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا پس منظر اور اس کی انتظامی تفصیلات۔

مستری فقیر محمد

کوکن میں شادی بیاہ کی رسمیں

(ترسیل ممبئی، ستمبر ۱۹۹۶ع، شمارہ ۱۱-۱۲، ص ۹۲-۹۵)

کوکن میں شادی بیاہ کی رسموں کا ایک جائزہ

نشیط، سید یحییٰ

دار المصنفین کے اردو مخطوطات

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۶ع، جلد ۱۵۷، شمارہ ۵، ص ۳۷۷-۳۹۸)

دار المصنفین میں موجود اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست

• •

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی
- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- عزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مصنفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مصنفہ)
- انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
- مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)

جناب عبدالرزاق قریشی
- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ محترمہ رقیہ اسماعدار

نوائے ادب بمبئی

FORM : IV - ROLL NO : VIII

Registration No 32009/50

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پالکا، بی کام (آنرز)
قومیت		ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر قومیت پتہ		ایضاً
نام ایڈیٹر		پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ	:	ایضاً

170692
16 (09)

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof N. S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Mumbai-400 001

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs. fifty • Foreign : £ 10

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ء میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ پوسٹ گریجویٹ تعلیم و تحقیق کا انتظام کرنا
۲ تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد کرنا
۹ اردو و دیگر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

• • •

نوائے ادب، بمبئی

(۱۹۵۰ء)

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

(سال میں دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو و متعلقہ زبانوں و ادبیات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو و دیگر متعلقہ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر نقد و تبصرے

(سالانہ چندہ : ۵۰ روپیے)

•

نوائے ادب کے مدیران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۵۰ سے ۱۹۵۵)
ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۵۶ سے ۱۹٦۷)
جناب عبدالرزاق قریشی (۱۹٦۸ سے ۱۹۷۵)
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷٦ سے جاری)

REGISTRATION NO. : [illegible]

NAWA-E-ADAB

([illegible])

VOLUME : XLVI
OCTOBER
1996

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
[illegible]